قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا چھہترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

اگست 2019ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

''لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ'' (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے





طلوعِ اسلام کے قارئین کو

جشنِ آزادی مبارک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوب تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبال، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثرانداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال وعمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

اگست 2019ء

جلد 71 | شمارہ نمبر 8

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: حج کا مقصد	ادارہ	4
اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی	شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ، لاہور	17
یاداس کی آئی غم تازہ ہوا	ادارہ	30
دوقومی قرآنی نظریہ پر مطالبہ پاکستان (قسط نمبر 29)	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	38
قرآن پر اعتراضات کے جوابات (قسط نمبر 4)	خواجہ ازہر عباس، کراچی	53
بچوں کا صفحہ: اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے	ادارہ	58

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ

پاکستان: 550 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 800 روپے سالانہ

بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

Surah Muhammad (محمّد) - Durus-al-Qur'an: Chapter 2 By G. A. Parwez (Translated by: Mansoor Alam)	60

ادارہ طلوعِ اسلام 25-B گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)

Phone: 042-35714546

Cell: 0321-4460787

idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions

Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions

IBAN:PK36NBPA0465004073177672

Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر 25-B، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

تو رازِ کن فکاں ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہوجا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل! اچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم! اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سر زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ وبیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا
ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعاتؔ

ایک درس

حج کا مقصد

پرویز صاحب نے اگست 1981ء میں ایک درس حج کے موضوع پر دیا تھا۔ اس تقریر کو ایک بار پھر تحریر کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس درس میں حج کے مقاصد، موجودہ اقوامِ عالم کی حالت، امتِ مسلمہ کو درپیش مسائل، اسرائیل اور فلسطین کی دردناک صورتِ حال کو جس طرح بیان کیا گیا تھا 38 سال گزرنے کے باوجود ایسا لگتا ہے کہ جیسے وقت کا دوران وہیں پر تھما ہوا ہے اور مسائل جوں کے توں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو حج کے موقعہ پر ایک بار پھر ماہنامہ طلوعِ اسلام کے صفحات کی زینت بنایا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے!

آپ نے یہ الفاظ ہر محراب و منبر اور ہر سٹیج اور پلیٹ فارم سے سنے ہوں گے، اور بار بار سنے ہوں گے کہ اسلام نوعِ انسان کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ الفاظ تو آپ نے بارہا بار سنے ہوں گے، لیکن یہ کسی کی زبان سے نہیں سنا ہوگا کہ نوعِ انسان کی مشکلات کیا ہیں اور اسلام ان کا حل کیا پیش کرتا ہے؟ اصل یہ ہے کہ جو قوم خود اپنی مشکلات کا حل دریافت نہ کر سکتی ہو..... اس کے لئے اُسے غیروں کے دروازے پر دستک دینی پڑتی ہو..... وہ نوعِ انسان کی مشکلات کا حل کیا پیش کر سکتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جب غیر اقوام ہمارا یہ دعویٰ سنتی ہیں تو استہزاء کی ہنسی ہنس کر کہتی ہیں کہ پہلے اپنی مشکلات کو تو حل کر لو، اس کے بعد نوعِ انسان کی مشکلات کے حل کا دعویٰ کرنا!

یہ درحقیقت ''مذہب'' کی ٹیکنیک ہے کہ وہ نہایت مقدس اور خوش آئند الفاظ کے ذریعے اپنے معتقدین کو خوش فہمی میں مبتلا رکھتا ہے اور اُن کے ذہن کو کبھی اِس طرف نہیں آنے دیتا کہ وہ ان الفاظ کا مفہوم معلوم کریں یا یہ سوچیں کہ ہم جو دعویٰ کرتے ہیں اُس کا عملی ثبوت کیا ہے۔ مذہب کا سارا دارومدار بلا مفہوم الفاظ کے دہرائے چلے جانے اور بلا نتیجہ رسومات ادا کئے جانے پر ہوتا ہے۔ چونکہ اسلام بھی الدین نہیں رہا، مذہب بن چکا ہے، اس لئے ہم بھی نہ الفاظ کے مفہوم کی طرف آتے ہیں اور نہ ہی اپنے دعاوی کے عملی ثبوت کی طرف۔

اِس وقت تمام اقوامِ عالم گوناگوں مشکلات کا شکار ہیں۔ میں ان میں سے ایک ایک پرابلم کا حل قرآنِ مجید کی روشنی میں

پیش کئے چلا آ رہا ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مری یہ کوشش قرآنی الفاظ' اصطلاحات' اور تصورات ونظریات کا متعین مفہوم پیش کرنے تک محدود ہے۔ عملی نتائج سے اس کے دعاوی کا ثبوت بہم پہنچانا میرے بس کی بات نہیں' کیونکہ وہ ثبوت تو قرآنی نظام کے قیام ہی سے بہم پہنچ سکتا ہے' اور نظام کا قیام کسی فرد کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ یہ اُمت کی اجتماعی کوششوں ہی سے ممکن ہوتا ہے۔ بایں ہمہ' میں شروع ہی سے اپنی ان کوششوں کو جاری رکھے ہوئے ہوں۔ ایک تو اس لئے کہ قوم کے اربابِ بصیرت اس حقیقت کو سمجھ سکیں کہ اِس وقت ہم میں جو کچھ اسلام کے نام سے ہو رہا ہے وہ مذہب ہے' دین نہیں۔ اور دوسرے اس لئے کہ اس سے شاید آنے والی نسلیں استفادہ کر کے دین کا نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے اقوامِ عالم متعدد' گوناگوں مشکلات اور پریشانیوں کا شکار ہیں..... میں اس وقت ان میں سے صرف ایک مسئلہ کو لوں گا جو درحقیقت مشکل ترین مسئلہ ہے اور نوعِ انسان کے موجودہ مصائب اور ممکنہ تباہی کا موجب ہے۔ اور وہ ہے نیشنلزم۔ میں اس موضوع پر اس سے پہلے بھی بہت کچھ لکھ چکا ہوں اور بتا چکا ہوں کہ خود اقوامِ مغرب اِس کے ہاتھوں کس قدر نالاں ہیں اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کس قدر مضطرب و بے قرار۔ لیکن انہیں کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میں اس نشست میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ قرآنِ کریم نے اس کا نظری حل کیا بتایا اور عملی پروگرام کیا تجویز کیا۔

☆.....☆.....☆

نیشنلزم:

نوعِ انسان کی تمدنی یا معاشرتی زندگی کی ابتداء کب اور کہاں سے ہوئی' مغرب کے علماءِ علم الانسان نے اس باب میں خاصی تحقیق کی ہے لیکن وہ اس باب میں ابھی تک کسی متعین نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ قرآنِ کریم اس قسم کی تحقیقات کے متعلق بحث نہیں کرتا۔ وہ بات اس مقام سے شروع کرتا ہے جو اس کے پیشِ نظر منزل تک پہنچنے کا آغازِ سفر ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ط (10:19) ''نوعِ انسان شروع میں ایک اُمت' ایک جماعت' ایک گروہ تھی۔ اس کے بعد انہوں نے آپس میں اختلاف پیدا کر لئے''۔ ان اختلافات کا نتیجہ تھا کہ وہ پہلے مختلف خاندانوں میں اور اس کے بعد قبیلوں میں بٹ گئے اور اس تفریق کو نسلوں تک پھیلا دیا۔ باہمی تقسیم اور تفریق کی یہ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ تا آنکہ اس نے مختلف قوموں کی شکل اختیار کر لی۔ رفتہ رفتہ اُس نے ایک سیاسی تصورِ حیات یا مسلکِ زندگی کا پیرہن اوڑھ لیا۔ اِس کا نام نیشنلزم ہے جو اس وقت پوری کی پوری نوعِ انسان کو محیط ہے۔ اِس سے نہ کرۂ ارض' کرۂ ارض رہا ہے اور نہ ہی انسان' نوعِ انسانی کا فرد۔ کرۂ ارض کو فرضی لکیریں کھینچ کر مختلف ممالک میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ان ممالک میں بسنے والے انسانوں کو مختلف قوموں کا نام دے دیا گیا۔ یہ قومیں بھیڑیوں کی طرح تاک میں بیٹھی رہتی ہیں کہ ان میں سے کسی کو کب اونگھ آئے اور یہ اس پر جھپٹ پڑیں۔ اس وقت پوری نوعِ انسان کی یہی کیفیت ہے' اس میں نہ اقوامِ مغرب کی تخصیص ہے اور نہ اقوامِ مشرق کی تمیز۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس مشرق کے ثوابت ہوں کہ مغرب کے ہوں سیار

قرآنِ کریم نے بتایا کہ نوعِ انسان اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی جس مصیبت کا شکار ہوگئی تھی اُس سے نجات دلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے وحی کی راہنمائی کا آغاز کیا۔ سورۂ بقرہ میں ہے:۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ (2:213)

چونکہ نوعِ انسان کو پھر سے ایک وحدت میں تبدیل کرنا مقصود تھا۔ اِس لئے اللہ تعالیٰ نے بعثتِ انبیاء کا سلسلہ شروع کیا جو انہیں اختلافی زندگی کے تباہ کن عواقب سے آگاہ کرتے اور ایک برداری بن کر رہنے کی زندگی کے خوشگوار ثمرات کی خوشخبری سناتے۔ وہ اپنے ساتھ قوانینِ خداوندی کا ضابطہ لاتے تاکہ وہ اُس کی رُو سے ان کے اختلافی امور کا فیصلہ کریں۔

عالمگیر برادری:

یہ تھا وحی کا مقصد اور وہ منزل جس تک کاروانِ انسانیت کو پہنچانا مقصود تھا۔ یعنی انہیں ایک عالم گیر برادری کے قالب میں ڈھالنا۔ اس کے لئے وحیؔ نے کہا کہ جو لوگ اس مقصد سے متفق ہیں وہ، رنگ، نسل، زبان، وطن اور قومیت کے اختلاف کے باوجود ایک اُمت کے افراد ہیں۔ جو اس سے انکار کرتے ہیں وہ ان کے بالمقابل دوسری اُمت کے افراد۔ اِسی کو ایمان اور کفر کے امتیاز سے تعبیر کیا گیا ہے، اور سیاسی اصطلاح میں اسے دوقومی نظریہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اگرچہ ہر نبی کا یہی پیغام تھا، لیکن اِس کی عملی تشکیل حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں وجود پذیر ہوئی۔ اُنہوں نے ماں باپ، برادری، قوم، اور وطن تک کو چھوڑ کر ایمان کی بنیادوں پر ایک نئی اُمت کی تشکیل کی اور اُس کا ایک اجتماعی نظام قائم کیا۔ نظام یا اجتماعیت کے لئے ایک محسوس مرکز کا وجود لاینفک ہوتا ہے۔ انہوں نے وحیٔ خداوندی کی راہنمائی میں مکہ کے مقام پر ایک علامتی مرکز تعبیر کیا، جسے کعبہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اِس کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (3:96)

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں سب سے پہلا گھر جو قوم، وطن رنگ، نسل کے امتیازات سے بلند ہو کر خالص انسانیت کی منزلِ مقصود کے لئے نشانِ راہ تھا۔

اِسے تمام انسانی نسبتوں سے بلند و بالا قرار دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے "اپنا گھر" (بَيْتِيَ 2:125) کہہ کر پکارا۔ یہاں ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے، اور وہ یہ کہ ویسے تو کائنات کی ہر شے خدا ہی کی ہے۔ لیکن اس نے جس چیز کو خاص طور پر "اپنی" کہہ کر پکارا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی، نہ اس پر کسی کا قبضہ ہوسکتا ہے۔ (مثلاً) بیت اللہ (اللہ کا گھر) یا ارض (اللہ کی زمین)۔

للناس کا مقصد:

مندرجہ بالا آیت میں کہا گیا ہے کہ کعبہ کو الناس (نوعِ انسان) کی اجتماعیت کا مرکز بنایا گیا۔ اِس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ کعبہ اور حج کے سلسلے میں جس قدر آیات قرآنِ کریم میں آئی ہیں اُن میں ہر جگہ ''الناس'' ہی کہا گیا ہے۔ یہ اِس لئے کہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، وحی خداوندی کا مقصود و مطلوب نوعِ انسان کی عالمگیر برادری کی تشکیل تھا۔ اس لئے جس مقام کو اس برادری کا مرکز قرار دیا گیا اسے ''للناس'' ہی کہا جانا چاہئے تھا۔ اور یہی قرآن نے کیا۔

جَعَلَ اللّٰہُ الۡکَعۡبَۃَ الۡبَیۡتَ الۡحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ (5:97)

اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو واجب الاحترام مقام قرار دیا تاکہ اس مرکزیت سے نوعِ انسان اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہو سکے۔

یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے دو لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اِنسانیت' قوموں میں تقسیم ہو تو وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہو سکتی۔ مثال کے طور پر آج دنیا کی قومیں دو حصوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ ایک سپر نیشنز.....یعنی بڑی مہیب قوتوں کی مالک قومیں۔ اور دوسری' کمزور اور غیر نشوونما یافتہ (Undeveloped) قومیں۔ کمزور قوموں کا طاقتور قوموں کے سہارے کا محتاج ہونا تو ظاہر ہے۔ یہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو ہی نہیں سکتیں۔ لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ خود سپر پاورز اپنی قوت کے لئے اِن کمزور قوموں کی محتاج ہوتی ہیں۔ جس قوم کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کمزور قومیں ہوں' وہ اُتنی ہی زیادہ طاقتور سمجھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بڑی قوم کی یہ انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ان کمزور قوموں کو زیادہ سے زیادہ امداد کا لالچ دے کر اپنے ساتھ رکھ سکیں' لیکن ایسا کبھی نہ ہونے دیں کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکیں۔

لیکن اگر قومیتوں کے مٹ جانے کے بعد نوعِ انسان اُمتِ واحدہ بن جائے تو اُسے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لئے کسی خارجی سہارے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ یہ ہے کعبے کی مرکزیت کا اوّلین ثمرہ۔ یعنی قیاماً للناس۔ نوعِ انسان کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا ذریعہ۔

اب آگے بڑھئے۔ اِس وقت دنیا میں کہیں امن نہیں۔ چھوٹی قومیں ہوں یا بڑی' سب ایک دوسرے سے ڈری اور سہمی ہوئی رہتی ہیں۔ جب قوموں کی یہ حالت ہے تو افراد' خوف و ہراس کے جس جہنم میں زندگی گذارتے ہیں' اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس وسیع و عریض کرۂ ارض پر کوئی چھوٹے سے چھوٹا مامن ایسا نہیں جہاں کوئی فرد یا قوم اپنے آپ کو محفوظ یا مامون سمجھ لے۔ کعبے کی مرکزیت کی دوسری خصوصیت کے متعلق قرآن نے کہا:

جائے اِمن:

وَاِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَیۡتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمۡنًا ؕ (2:125) اور ہم نے کعبہ کو نوعِ انسان کی اجتماعیت کا مرکز بنایا اور ایسا مقام جہاں کسی کو کسی قسم کا خوف و خطر نہ ہو۔

دوسری جگہ ہے: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ (3:97) ''جو بھی اس نظام میں داخل ہو جائے گا جس کا یہ مرکز ہے' اُسے امن کی ضمانت مل جائے گی''۔

بات واضح ہے' دنیا میں خوف وخطر تو مختلف قومیتوں کا پیدا کردہ ہے۔ جب اِن کی جگہ ایک ایسی اُمت وجود میں آ جائے گی جس میں یہ تفریق نہیں ہوگی تو وہ بھائیوں کی طرح امن وسلامتی سے رہے گی۔ اسے نہ کسی خارجی خطرہ کا اندیشہ ہوگا' نہ داخلی خلفشار کا ڈر۔ سوچئے کہ اس سے یہ کرۂ ارض جو اس وقت جہنم زار بن رہا ہے' کیسا امن وسلامتی کی جنت بن جائے گا!

موجودہ قومیتوں کی تقسیم کی ایک لعنت یہ بھی ہے کہ کسی ایک ملک کا باشندہ' دوسرے ملک میں قدم تک نہیں رکھ سکتا جب تک وہ اس سے اجازت نامہ (VISA) حاصل نہ کر لے۔ کعبہ کے متعلق کہا:

جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨالْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ؕ (22:25)

یہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر کے' اس گھر کے دروازے سب کے لئے یکساں طور پر کھلے ہیں' کسی کو یہاں آنے کی ممانعت نہیں' کسی سے اجازت نامہ حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ تمام انسانوں کے خدا (ربّ الناس) کا گھر ہے' اس لئے اس کے دروازے ہر انسان کے لئے کھلے رہیں گے۔

یہی نہیں کہ جس کا جی چاہے یہاں آ جائے۔ حضرت ابراہیمؑ نے تعمیرِ کعبہ کے بعد یہ دعا مانگی تھی کہ اس خطہ زمین میں کچھ پیدا نہیں ہوتا' جو لوگوں کے لئے وجہِ کشش ہو سکے۔ بارِ الٰہا! تو ایسا کر دے کہ لوگوں کے دل اس طرف مائل ہو جائیں اور وہ فوج در فوج اِدھر آنے لگ جائیں (14:37)۔

یہ تھیں اس گھر کی خصوصیات جسے تمام نوعِ انسان کے لئے مرکز قرار دیا گیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ خصوصیات مٹی اور پتھر کے کسی مقام پر گھر کی نہیں۔ یہ خصوصیات اس نظام کی ہیں جس کا مرکز یہ گھر قرار دیا گیا ہے۔ جس طرح (مثلاً) ہم کہتے ہیں کہ ماسکو کی پالیسی یہ ہے اور واشنگٹن نے یہ طے کیا ہے' تو اس سے مراد ماسکو اور واشنگٹن کے شہر نہیں ہوتے۔ اس سے مراد وہ مملکتیں ہوتی ہیں جن کے یہ شہر مراکز ہیں۔

اسی طرح ''کعبہ'' سے مراد' وہ نظامِ خداوندی' وہ قرآنی مملکت ہے' جس کا یہ مرکزی مقام ہے۔

☆.....☆.....☆

حضرت ابراہیمؑ کے مقدس ہاتھوں اس مرکز کی تعمیر ہوئی۔ اس کے بعد آپ' صدیوں پر پھیلے ہوئے تاریخ کے اوراق کو اُلٹ کر' چھٹی صدی عیسوی میں آ جایئے جہاں وہ نظام اپنی مکمل شکل میں قائم ہوا جس کا مرکز کعبہ تھا۔ اس نظام کے قیام کے لئے سب سے پہلے ایک اُمت تشکیل کی گئی جو رنگ' نسل' خون' وطن کے امتیازات کو مٹا کر خالص ایمان کی بنیادوں پر وجود میں آئی تھی۔ اس اُمت کے وجود کا مقصد کیا تھا' اِسے قرآن نے ان چند الفاظ میں نہایت جامعیت سے بیان کر دیا۔ جب کہا کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (3:110) ''تم وہ بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسان کے لئے پیدا کیا گیا ہے''۔ غور

کیجئے! جس طرح کعبہ کا مقصد نوعِ انسان کی فلاح و بہبود تھا اُسی طرح اس اُمت کی بعثت کا مقصد بھی پوری کی پوری انسانیت (للناس) کی خیر طلبی تھا۔ اِس مقصد کے حصول کے لئے اس اُمت نے ایک نظام قائم کیا۔ اس نظام کی رُو سے اس اُمت کا فریضہ یہ قرار دیا گیا ہے کہ:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (2:143)

اس طرح ہم نے تمہیں ایک ایسی اُمت بنایا جو تمام نوعِ انسانی سے یکساں فاصلے پر رہے۔ نہ کسی کی طرف یونہی جھکی ہوئی، نہ کسی سے یونہی کھنچی ہوئی۔ فریضہ تمہارا یہ ہے کہ تم نوعِ انسانی پر نگاہ رکھو کہ اس کا قدم غلط سمت کی طرف نہ اُٹھنے پائے۔ اور تم پر تمہارے نظام کی مرکزی اتھارٹی (رسولؐ) نگاہ رکھے کہ تم غلط راستہ اختیار نہ کرلو۔

یہاں پھر ''شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ'' کہا گیا ہے۔ یعنی تمام نوعِ انسان پر نگران۔ اِن خصوصیات کی حامل اُمت کو ''ملت ابراہیمیؑ'' (6:162) کی پیروکار کہہ کر پکارا گیا، یعنی حضرت ابراہیمؑ کی روش پر چلنے والی اُمت۔

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کہا گیا تھا: اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ (2:124) ''نوع انسان کی امامت (Leadership) تمہارے حصے میں آئے گی''۔ اور اسی بنا پر اس اُمت سے کہا: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ (2:125) ''تم منصب و مقامِ ابراہیمیؑ کے حصول کو اپنی تگ و تاز کی جولاں گاہ بناؤ''۔ یعنی جس طرح حضرت ابراہیمؑ کو نوعِ انسان کی امامت کا سزاوار قرار دیا گیا تھا اسی طرح تم بھی اس نظام کے قیام سے، جس کا مرکز کعبہ ہے، عالمگیر انسانیت کی لیڈرشپ حاصل کرو۔

حج:

اِس اُمت نے جو نظام قائم کیا تھا، اس کی بنیاد باہمی مشاورت پر تھی (42:38)۔ اِس مشاورت کی روزمرہ کی شکل تو صلوٰۃ کے اجتماعات تھے..... آپ غور کیجئے کہ مشاورت کا حکم اور اقامتِ صلوٰۃ کا حکم ایک ہی سانس میں دیا گیا ہے (42:38)۔ لیکن پوری مملکت کے مسائل کے لئے مشاورت کے اجتماعات اِس سے کہیں زیادہ وسیع (بلکہ عالمگیر) پیمانے پر ہونے ضروری تھے۔ اُمت کے اس عالمگیر اجتماع کو حج کہہ کر پکارا گیا۔..... اس کے علاوہ نسبتاً چھوٹے پیمانے پر جو اجتماعات منعقد کئے جانے ضروری تھے انہیں عمرہ کہا گیا۔ اس اجتماعِ عظیم کا آغاز بھی حضرت ابراہیمؑ نے کیا تھا جب انہیں حکم دیا گیا تھا کہ: وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ (22:27) ''تم اعلان کردو، تمام انسانوں کو دعوت دو کہ وہ حج کے اجتماع میں شرکت کے لئے آئیں''۔ اس اُسوۂ ابراہیمیؑ کے اِتباع میں اِس اُمت پر بھی یہ فریضہ عائد ہوگیا کہ وہ اِن اجتماعات کے انعقاد کا اہتمام کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ اجتماعات اصلاً تو اُمت کی باہمی مشاورت کے لئے ہوں گے، لیکن ان میں شرکت کے لئے تمام

انسانوں (الناس) کو دعوت دی گئی ہے یہ بحیثیت مبصر شریک ہوں گے۔ اِس سے مقصد کیا ہے' اس کے متعلق ہم آگے چل کر وضاحت کریں گے۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا تھا کہ: وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ (22:27) ''حج کے لئے تمام لوگوں کو دعوت دو''۔ اسی طرح اُمتِ مسلمہ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے حج کے متعلق بھی کہا کہ: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ (3:96) ''جو لوگ بھی (الناس) وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں' انہیں چاہئے کہ ان مقاصد کے حصول کے لئے جنہیں خدا نے مقرر کیا ہے (للہ) حج کے اجتماع میں شرکت کریں''۔ آپ غور کیجئے کہ یہاں بھی الناس کہا ہے' اسے مؤمنین (مسلمانوں) تک محدود نہیں رکھا گیا۔

عربوں کے ہاں حج کا اجتماع زمانۂ قبل از اسلام میں بھی ہوتا تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب حضرتِ ابراہیمؑ تعمیر کعبہ سے فارغ ہوئے ہیں تو ان سے کہا گیا تھا کہ حج کے اجتماع کا اہتمام کریں اور لوگوں کو اس میں شرکت کی دعوت دیں۔ لیکن جس طرح' جب دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کے بلند و بالا پروگرام کے عملی اجزاء' بے معنی رسومات بن کر رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح عربوں میں حج کے اجتماع نے بھی (کم وبیش) ایک میلہ کی شکل اختیار کر رکھی تھی' اور حج ابراہیمیؑ کے مناسک اور شعائر' مشرکانہ اور فاسقانہ (بلکہ جاہلانہ) رسوم بن کر رہ گئے تھے۔ بایں ہمہ اسے اہمیت بڑی حاصل تھی۔ اس اعتبار سے' تمام عربوں کی عمرانی زندگی کا مرکز تھا' اور قریش کو اس کی تولیت کی وجہ سے خاص امتیازی پوزیشن حاصل تھی۔ مادہ کے اعتبار سے اس لفظ (حج) کے معنی قصد و ارادہ کے بھی ہیں اور روک دینے کے بھی۔ زمانۂ قبل از اسلام میں حج کے اجتماع میں' علاوہ دیگر امور قبائل کے باہمی جھگڑے نمٹائے جاتے تھے۔ اور زیادتی کرنے والوں کو ان کی دراز دستیوں سے روکا جاتا تھا۔ لیکن یہ روکنا تلوار کے ذریعے نہیں ہوتا تھا' دلائل و براہین کی رُو سے ہوتا تھا۔ یہیں سے لفظ حجت ہے جس کے معنی ''دلیل'' کے ہیں۔ اِس جہت سے قرآنی دلائل کو الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ (6:149) کہا گیا ہے۔ اِس لفظ کے اِن بنیادی معانی اور تصورات سے اس اجتماع کا مقصد سامنے آ جاتا ہے۔ یعنی دلائل و براہین پر مبنی مشاورت سے مملکت کے معاملات کا حل تلاش کرنا' اور غلط کاروں کو ان کے اقدامات سے روکنے کی تدابیر سوچنا۔

حج اسلام:

قرآنِ کریم نے عربوں کے اس اجتماع کو نہ صرف باقی رکھا' بلکہ اسے دین کے نظام میں ایک بنیادی ستون قرار دیا۔ فتح مکہ سے پہلے (7ھ تک) کعبہ (کفار) قریش کی تحویل میں تھا اِس لئے وہاں' قرآنی انداز کے اجتماع (حج) کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فتح مکہ کے بعد' 8ھ کا حج تو کم وبیش سابقہ روش پر ادا ہوا۔ لیکن 9ھ میں اسے قرآنی شکل دے دی گئی۔ اِس میں حضور ﷺ خود تو تشریف نہیں لے گئے' لیکن حضرت ابوبکرؓ صدیق کو نمائندہ مملکتِ قرآنیہ کی حیثیت سے' قافلۂ حجاج کا سربراہ بنا کر بھیجا۔ اس اجتماع میں کم وبیش تمام سابقہ رسوم و مناسک کو برقرار رکھا' لیکن انہیں مشرکانہ اور جاہلانہ آمیزشوں سے پاک اور صاف کر کے۔ اس سے پہلے حج کی سب سے بڑی خصوصیت وہ اعلانِ عظیم تھا جو مدینہ کی اسلامی مملکت کی طرف سے' غیر

مسلموں (بالخصوص قریش) کے ساتھ تعلقات کا منشور تھا اور جو سورۂ توبہ میں مذکور ہے۔ 10ھ میں یہ اجتماع خود ذاتِ رسالتمآب ﷺ کے زیرِ لوا منعقد ہوا اور اس میں حضور ﷺ نے وہ خطبہ ارشاد فرمایا جو عالمگیر انسانیت کے لئے صحیفۂ آزادی قرار پاتا ہے۔ اس کا نقطۂ ماسکہ یہ تھا کہ انسانوں کے خودساختہ رنگ و نسل، خون، زبان، وطن، قومیت، ذات پات، برادری، قبائل، ہر قسم کے امتیازات کو مٹا کر، خالص ایمان کی بنیادوں پر، انسانوں کی عالمگیر برادری کی تشکیل۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں بھی یہ اجتماع، انہی مقاصدِ عالیہ کے حصول کا ذریعہ تھا جنہیں قرآن نے متعین فرمایا تھا۔ اس میں وسیع و عریض مملکتِ اسلامیہ کے نمائندگان شریک ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ، ان لوگوں کو بھی خصوصی دعوت دی جاتی تھی۔ جنہیں ارکان و عمالِ حکومت کے خلاف کسی قسم کی شکایت ہوتی۔ چونکہ یہ اجتماع مملکت کے دور دراز علاقوں سے آنے والوں پر مشتمل ہوتا تھا، اس لئے میدانِ عرفات میں ان کا باہمی تعارف ہوتا تھا۔ اسی جہت سے اسے عرفات کہتے تھے۔ (یعنی باہمی تعارف کی تقریب) سربراہِ مملکت یا اُس کا نمائندہ، اپنے خطاب میں اس پروگرام کا اعلان کرتا جو آئندہ سال کے لئے تجویز ہوتا تھا۔ اس کے بعد، یہ نمائندگانِ مملکت، منیٰ کے میدان میں جمع ہوتے۔ وہاں اور تین دن تک قیام کر کے اس پروگرام کی تفصیلات پر غور و خوض کرتے۔ امورِ مملکت کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھایا جاتا۔ مستغیثین کی شکایات کا ازالہ کیا جاتا۔ اور یہ سب کچھ دلائل و حجت کی رُو سے کیا جاتا، دھاندلی اور سینہ زوری سے نہیں۔ ان فیصلوں اور تجویزوں کو ساتھ لے کر، یہ نمائندگان، اپنے اپنے مقامات کی طرف واپس جاتے۔

قربانی؟

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ مکہ، اس وادی میں واقع ہے جہاں کچھ پیدا نہیں ہوتا (14:37)۔ اس علاقہ میں اگر لاکھوں انسانوں کا اجتماع ہو تو سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوگا کہ ان کے کھانے پینے کا کیا انتظام ہوگا؟ قرآن کریم اس قسم کے اہم سوال کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اس نے کہا کہ اس اجتماع میں شرکت کرنے والے اپنی ''خوراک'' اپنے ساتھ آپ لائیں..... اور ظاہر ہے کہ گوشت سے بہتر خوراک کونسی ہوسکتی تھی؟ اس نے کہا کہ یہ آنے والے کچھ فالتو اونٹ اپنے ساتھ لائیں۔ آتے وقت ان پر بے شک سامانِ تجارت وغیرہ لاد لیں، اور یہاں پہنچ کر انہیں ذبح کریں۔ اُن کا گوشت خود بھی کھائیں، اور مکہ کے اُن غرباء کو بھی کھلائیں جنہیں عام حالات میں گوشت نصیب نہیں ہوتا۔ سورۂ حج کی آیات (22:33; 22:36; 22:28) میں یہ تمام تفصیل درج ہے۔ ان کے لئے قربانی کا لفظ سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ (نہ ہی ان جانوروں کے متعلق جنہیں بقرعید پر، قربانی کہہ کر ذبح کیا جاتا ہے)۔

اِس کے بعد حج کے اُس بنیادی مقصد کی طرف آیئے جس کی تشریح کو ہم نے قصداً اس مقام کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ پہلے تمہیداً یہ سمجھ لینا چاہئے کہ دین کے مقاصد محض نظری تصورات یا ذہنی عقائد نہیں ہوتے، وہ محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں اور دین کے دعاوی کا ایسا عملی ثبوت بنتے ہیں جس سے انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔ حج کے سلسلے میں بھی قرآنِ کریم نے اس کا اسی

قسم کا مقصد بتایا۔ سورۂ حج میں ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ تعمیر کعبہ سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا:۔

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۙ۝ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (22:27-28)

تم لوگوں میں اعلان کردو کہ وہ حج کے لئے یہاں آیا کریں..... دنیا کے دور دراز گوشوں سے، لمبی لمبی مسافتیں طے کرتے، پا پیادہ یا ایسی سواریوں پر جو سفر کی مشقت سے تھک کر چور ہو جائیں۔

وہ یہاں اس لئے آئیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام اُن کی (یعنی نوع انسان کی) منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔

نوعِ انسان کی منفعت:

اِس میں ''لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ'' (22:28) کے الفاظ بڑے گہرے غور و تدبر کے متقاضی ہیں۔ کہا یہ گیا ہے کہ لوگ آئیں اور اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں کہ یہ نظام ان کی منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ مشاہدہ اس چیز کا ہوسکتا ہے جو محسوس طور پر سامنے آ جائے۔ یہ دعوت ''الناس'' کو دی جاتی تھی جس میں اُمتِ مسلمہ بھی شامل ہے اور غیر مسلم بھی۔ اِس اُمت کے افراد یہ دیکھ لیں کہ یہ نظام اُن کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے اور غیر مسلم بھی اس کا مشاہدہ کرلیں کہ یہ نظام عالمگیر انسانیت کے لئے کس قدر منفعت بخش ہے۔ یہ نفع سامانیاں بھی ان کے سامنے محسوس شکل میں آئیں گی۔

واضح رہے کہ قرآنِ کریم نے حسنِ عمل۔ کارِ خیر۔ ''ثواب'' کے کاموں کے پرکھنے کا ایک ہی معیار بتایا ہے۔ اور وہ یہ کہ: وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۭ ''(13:17) ''دنیا میں بقا اسی عمل کے لئے ہے جو تمام نوع انسان (الناس) کے لئے نفع بخش ہو''۔ دین اور اس کے ارکان و شعائر کی علت یہ ہے کہ ان سے ایسے نتائج مرتب ہوں جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت کا موجب ہوں۔ حج کے اجتماع میں ان منفعت بخش نتائج کو سامنے لایا جاتا تھا، اور اسی کے لئے تمام انسانوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ.....

قرآنی نظامِ مملکت میں غیر مسلموں کو شریکِ حکومت تو نہیں کیا جاسکتا، لیکن بعض فنی اور ٹیکنیکی معاملات میں اُن سے مشورہ کیا جاسکتا ہے۔ حضرت عمرؓ ایسا کیا کرتے تھے، اور اس زمانے میں غیر مسلم مکے میں آیا جایا کرتے تھے۔ (کتاب الخراج، امام یوسفؒ۔ بحوالہ شبلی نعمانیؒ)۔ غیر مسلموں کو حج کے اجتماع میں مبصر کی حیثیت سے شریک ہونے کی دعوت دی جائے گی تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام اُن کی بہبود کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ لیکن اس کے لئے ایک شرط ضروری ہے، اور وہ یہ کہ اِس میں کوئی شخص کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا جو ان مقاصد کے خلاف جائے جنہیں خدا نے مقرر کیا ہے۔ ایسا کرنے کو شرک سے تعبیر کیا گیا ہے (22:25)۔ اسی بنا پر مشرکینِ مکہ کو اس میں شرکت سے روک دیا گیا تھا (9:3، 9:28)۔

بہرحال مقصد اس اجتماع سے یہ تھا کہ نوعِ انسان کو بتایا اور دکھایا جائے کہ قرآنی نظام ان کی منفعت اور بہبود کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔

☆.....☆.....☆

ہمارا حج:

یہ تھا اجتماعِ حج کا مقصد۔ اُس زمانے میں دینؔ اپنی اصلی شکل میں موجود تھا' لیکن جب وہ مذہب میں تبدیل ہو گیا تو اس کے مقاصد نگاہوں سے اُوجھل ہو گئے۔ مذہب کرتا یہ ہے کہ دینؔ کی روح (مقصد اور غایت) کو فنا کر دیتا ہے لیکن اس کے شعائر اور مناسک کو علیٰ حالہٖ برقرار رکھتا ہے' اور ان کی رسمی پابندی پر بڑا زور دیتا ہے۔ اس سے قوم اس خوش فہمی میں مبتلا رہتی ہے کہ احکامِ خداوندی کا اتباع ہو رہا ہے۔ اس سے انہیں ایک عقیدتمندانہ اطمینان حاصل ہو جاتا ہے جو اُن کے اپنے ہی دل کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر عوام ان رسوم و مناسک کی انتہائی جذب و عقیدت سے پابندی کئے جاتے ہیں' یہ دیکھے بغیر کہ ان کا کوئی نتیجہ بھی برآمد ہو رہا ہے یا نہیں۔ اسی میں مذہب کی کامیابی کا راز پنہاں ہے۔ لوگ اگر سوچنے لگ جائیں تو مذہب کے مفاد و مقاصد ختم ہو جاتے ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ موجودہ حج پر نگاہ ڈالیں اور سوچیں کہ کیا اس سے وہ مقاصد حاصل ہوتے ہیں جن کے لئے اِس کا انعقاد ضروری قرار دیا گیا تھا۔ بات یہاں سے چلی تھی کہ وحی کی غایت اور انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ رنگ' نسل' زبان' خون' وطن اور قومیت کے اختلافات کو مٹا کر (جن کی وجہ سے نوعِ انسان ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے) اُسے پھر سے ایک عالم گیر برادری کے قالب میں ڈھال دیا جائے۔ اس کے لئے ایک نظام تجویز ہوا تھا' جس کا مرکز کعبہ تھا' اور جس کے اجتماع کا نام حج تھا۔ حج کا اجتماع اب بھی ہوتا ہے' اور پہلے سے کہیں زیادہ جوش و خروش کے ساتھ وسیع تر پیمانے پر۔ ایک ایک اجتماع میں پندرہ پندرہ' بیس بیس لاکھ حاجی شریک ہوتے ہیں۔ چالیس' پچاس ہزار کا انبوہِ عظیم تو صرف پاکستان سے اس میں شرکت کے لئے جاتا ہے۔ حکومت کا ایک پورا محکمہ اس کے انتظامات کے لئے وقف ہے۔ وہ سال بھر اسی میں مصروف رہتا ہے۔ ان چالیس' پچاس ہزار حاجیوں کے لئے (مملکت کا انتہائی مشکلوں سے حاصل کردہ) زرِمبادلہ جس قدر صرف ہوتا ہے' وہ ظاہر ہے۔ یہ حاجی' شدت کی گرمی اور دیگر ناسازگار حالات میں سفر کی صعوبات برداشت کرتے ہیں۔ اِس میں مہینوں لگ جاتے ہیں جن میں وہ کوئی اور کام ہی نہیں کر پاتے۔

وقت' توانائی' روپیہ کے اس صرف اور اس قدر جانکاہ مشقتوں کا حاصل کیا ہوتا ہے؟ ان افراد کا جذباتی اطمینان کہ ہم نے ایک فریضہ ادا کر لیا ہے۔ محض افراد کا جذباتی اطمینان تو کوئی ایسی خصوصیت نہیں جس کی بنا پر اسلام کو ایک منفرد نظامِ حیات قرار دیا جا سکے! اِس قسم کا اطمینان تو تمام اہل مذاہب اپنے اپنے طور پر حاصل کر سکتے اور کر لیتے ہیں!

علاوہ ازیں دنیا کے تمام مسلمان اُسی طرح مختلف قوموں اور وطنوں میں منقسم ہیں جس طرح غیر مسلم۔ ان ممالک اور اقوام کے افراد حج کے اجتماع میں بھی اپنے اپنے وطنی اور قومی تشخص کو برقرار رکھتے ہیں۔ مذہبی تفریق اس پر مستزاد ہے۔ اِس کی شدت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ چند سال ادھر کی بات ہے کہ پاکستان کے ایک بہت بڑے مذہبی رہنما نے بڑے فخر سے کہا تھا کہ ہم تو حریم کعبہ میں بھی' امامِ کعبہ کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے ..... اپنی جماعت الگ کرتے ہیں۔

یہ ہے کیفیت ہمارے اس اجتماع کی جس کا مقصد وطنوں اور قومیتوں کے امتیازات کو مٹا کر تمام نوعِ انسان کو ایک مرکز پر جمع کرنا تھا۔ دینؔ جب اپنی اصلی شکل میں موجود تھا تو مسلمانوں کا (حج تو ایک طرف) نمازوں تک کا اجتماع، مخالفین کے دلوں میں، دھڑکن پیدا کر دیا کرتا تھا اب کیفیت یہ ہے کہ مسلمانوں کی قریب ایک ارب آبادی کے بحرِ ذخار میں اسرائیلی مملکت کی حیثیت خس وخاشاک سے زیادہ نہیں۔ سالہا سال سے لاکھوں کا یہ اجتماع عرفات کے میدان میں رو رو کر خدا سے فریاد کرتا چلا آ رہا ہے کہ غاصب اور مغضوب علیہ اسرائیل کا بیڑا غرق ہو اور اسرائیل ہے کہ مستحکم سے مستحکم تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ ہے ''مذہب کے حج'' کا نتیجہ۔ الدینؔ کا حج ہوتا تو اس کے صرف اعلان پر دنیا کی بڑی سے بڑی غلط کوش قوم کپکپانے لگ جاتی! اب یہ اُمت، غیر مسلموں کی چھوٹی سے چھوٹی قوموں سے ڈرتی اور کانپتی ہے۔ حج کے عظیم اجتماع میں خالی دعائیں مانگ کر چلی آتی ہے اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو جھوٹا اطمینان دے لیتی ہے کہ یہودی ''مغضوب علیہ'' قوم ہیں اس لئے یہ تباہ ہو کر رہیں گے۔ کمزور انسان اپنے مخالف کو گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتے ہیں۔

اُمت کی یہ حالت ہے اور اس کے مذہبی پیشوا اس پر مسلسل زور دیئے جاتے ہیں کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ارکانِ اسلام کی رسمی طور پر پابندی کرتے رہیں اور ان کی غرض وغایت اور مقصود ومطلوب کے متعلق کچھ نہ سوچیں۔ اسی میں ہماری مختلف مملکتیں بھی اپنا اپنا مفاد مضمر دیکھتی ہیں اور مذہبی پیشوائیت کے فروغ کا سامان بہم پہنچا کر انہیں تاکید کرتی ہیں کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اسی کے پیشِ نظر، ابلیسؔ نے اپنے مشیروں سے کہا تھا: ؎

یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام!

(ابلیس کی مجلس شوریٰ۔ ارمغانِ حجاز)

ابلیسؔ کا یہ سحر اس وقت ٹوٹے گا جب یہ قوم کتاب اللہ کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنائے گی۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو خدا کا یہ انتباہ کارفرما ہو کر رہے گا کہ: وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ۙ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ (47:38)۔

اگر یہ (قرآن سے اسی طرح) رُوگرداں رہے تو ان کی جگہ کوئی دوسری قوم لے لے گی، اور وہ ان جیسی نہیں ہوگی۔

خدا کے وعدوں کی طرح اس کی وعیدیں بھی اٹل ہوتی ہیں! اس استبدالِ قومی میں جو تباہی آتی ہے، وہ بڑی قیامت خیز ہوتی ہے۔ والسلام

پرویزؔ (اگست 1981ء)

☆.....☆.....☆

خصوصی اپیل

(بے مثال تفسیرِ قرآن کی نشر و اشاعت کے لئے تعاون کی درخواست)

غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ نے ساری عُمر قرآن کریم کی تحقیق، تعلیم اور ترویج کرنے میں بسر کی۔ اُنہوں نے خالص قرآن کی مدد سے عصرِ حاضر کے علمی، تحقیقی، سائنسی اور تنقیدی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے قرآن کے اصلی پیغام الحق کو ہم تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پینتیس سال کے لگ بھگ ہفتے کے ہر جمعہ/ اتوار کو باقاعدگی سے درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ اُن کے دروس آڈیو/ وڈیو میں منتقل کئے جاتے تھے جن میں پورے قرآن کا بڑی تفصیل سے لگ بھگ ایک ہزار گھنٹے پر محیط جائزہ لیا گیا ہے۔ بعد میں انہی ٹیپ کی مدد سے اِن دروس کو ٹائپ کر کے مطالب القرآن فی دروس الفرقان کے نام سے کتابی شکل میں 41 ضخیم جلدوں میں شائع کر دیا گیا ہے۔ **ادارہ طلوع اسلام** نے اِسے تبلیغ کا فریضہ خداوندی سمجھتے ہوئے نبھایا ہے اور احباب سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اِن کُتب کو ادارہ سے خرید کر زیادہ سے زیادہ لوگوں اور اداروں تک اپنا تبلیغی فرض سمجھتے ہوئے پہنچائیں۔ اِس عمل میں اگر آپ ادارہ کو مطلوبہ افراد کی فہرست فراہم کر دیں گے تو وہ اس تفسیر قرآنی کا ایک سیٹ آپ کی جانب سے آپ کے دئے ہوئے پتہ پر بھجوا دے گا۔ تعلیمی اداروں میں خصوصی طور پر تعلیمی درسگاہیں اور پبلک لائبریریاں زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ادارہ کے پاس اِن کی فہرست موجود ہے جو ضرورت پڑنے پر مہیا کی جاسکتی ہے۔ آپ کو اِس امر سے یہ بھی تسلی رہے گی کہ آپ نے نہ صِرف اپنی طرف سے تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے ہوئے اللہ کے کام میں رفاقت کی سعادت حاصل کی ہے بلکہ ادارے کی بھی اِس فریضہ کی ادائیگی کو جاری رکھنے میں بھرپور مدد فراہم کی ہے۔

(41) اکتالیس ضخیم جلدوں پر مشتمل اِس منفرد تفسیر کا ہدیہ مبلغ 20000 روپے ہے۔ اگر آپ یہ تفسیر کسی لائبریری یا دوست کو گفٹ کرنا چاہتے ہیں تو ادارہ کو صرف -/15000 روپے ارسال کر دیجئے۔ ادارہ آپ کی جانب سے یہ تفسیر قرآن مطلوبہ لائبریری یا فرد تک بھجوا دے گا۔ عطیات کے لئے ادارہ کا اکاؤنٹ نمبر درج ذیل ہے۔ ہماری دلی تمنا یہ ہے کہ دروس القرآن کی یہ اکتالیس (41) ضخیم جلدوں پر مشتمل قرآنِ کریم کی مکمل تفسیر پاکستان کی ہر یونیورسٹی کی لائبریری کی زینت بنے تا کہ وہاں کے تمام طالب علم قرآنِ کریم کی اس بے مثال تفسیر سے استفادہ کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری معصوم آرزو کو شرف قبولیت بخش دے اور صاحب حیثیت لوگ اس سلسلے میں آگے بڑھیں اور اس کام میں ہماری مدد کریں تا کہ تبلیغ دین کے اس فریضہ سے ہم سب عہدہ برا ہو سکیں۔ شکریہ

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore
For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672
For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت ادارہ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ الحج	(22)	380	350/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورہ آل عمران (اول)	(3)	472	500/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	400	500/-	سورہ یٰسین	(36)	164	150/-
سورۃ انفال	(8)	210	250/-	سورہ الصٰفّٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورہ توبہ	(9)	530	550/-	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورۂ یونس	(10)	360	400/-	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-	سورۂ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطّور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-	سورۂ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 56-57)	384	400/-
سورہ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-15)	500	500/-	28 واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	(58-59-60-61-62-63-64-65-66)	300	300/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-				
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	400/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ الکہف وسورہ مریم	(18-19)	532	500/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) فون نمبر: +92 42 3571 4546 +92 321 4460 787

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی

میں ادارہ طلوعِ اسلام کے چیئرمین جناب محمد اکرم راٹھور کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنے رفقاء کے مطالبہ پر میرے جیسے ایک ادنےٰ تلمیذ القرآن کو بزم طلوعِ اسلام کے اراکین اور سامعین درسِ قرآن کی اس محفل سے خطاب کرنے کی دعوت دی ہے اور خطاب کا موضوع بھی متعین فرمایا کہ:

''اَلۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی اور ان کا انسانی زندگی سے تعلق''

میرے لئے یہ بڑی سعادت کی بات ہے۔ فلہٰذا آج بمورخہ 5 مئی 2019ء بروز اتوار اپنی کم علمی کے باوجود اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتا ہوں لیکن ایک امر کا برملا اعتراف کرتا ہوں کہ جو کچھ میں اس محفل میں سامعین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اس میں استادِ محترم علامہ غلام احمد پرویز مرحوم کے انداز اور قرآنی مفہوم کا تتبع کیا ہے بلکہ اکثر مقامات پر ان کی تحریروں کو اپنایا گیا ہے۔ اُمید ہے معزز سامعینِ کرام اسے برداشت کر لیں گے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے:

اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ؕ لَہُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی (20:8)

اللہ اس کے سوائے کوئی الٰہ نہیں۔ اسی کے ہیں اچھے نام۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَلِلّٰہِ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی فَادۡعُوۡہُ بِہَا ۪ وَذَرُوا الَّذِیۡنَ یُلۡحِدُوۡنَ فِیۡۤ اَسۡمَآئِہٖ ؕ سَیُجۡزَوۡنَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (7:180)

اور اللہ ہی کے ہیں سب اچھے نام سو ان کے ساتھ اس کو پکارو اور ان کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں میں ٹیڑھی راہ چلتے ہیں۔ انہیں اس کا بدلہ دیا جائے گا جو وہ کرتے تھے۔

قبل اس کے کہ میں ''اَلۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی'' پہ بات کروں، میں یہ واضح کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ یہ ساری گفتگو انسانوں کی زبان میں ہوگی جو علاقائی مخصوص حالات میں انسانوں نے مرتب کی ہے اس لئے بعض ایسی باتیں جو علاقائی مخصوص حالات یا تقاضوں کے متعلق نہ ہوں، انہیں بیان کرنا ایک دشوار امر ہے۔

آیۂ زیرِ نظر (20:8) میں اللہ تبارک (25:1) وتعالیٰ (6:100) کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ اللہ وہ بلند بالا ہستی ہے جو انسانوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ جس کی عظمتوں کے سامنے انسانی عقل وادراک متحیر رہ جاتے ہیں۔ جس کا اقتدار تمام کائنات پر چھایا ہوا ہے۔ جس کی اطاعت نہایت ضروری ہے لیکن ہم اس کی اطاعت اس کے قانون کی رُو سے کر سکتے ہیں جو اس نے اپنی طرف سے بذریعہ وحی ہمیں دیا ہے اور جو اب قرآن کریم میں محفوظ ہے۔

کائنات میں جو کچھ بھی ہوتا ہے سب اسی کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ عالمِ امر میں بھی اسی کا قانون کارفرما ہے اور عالمِ خلق میں بھی۔ یہ قوانین اس نے اپنی مشیت سے بنائے ہیں اور اسی کی قدرت (کنٹرول واختیار) سے یہ قوانین نافذ العمل اور کارفرما ہیں اور یہی وہ سنت اللہ ہے جس میں تبدیلی نہیں ہوتی (35:43)۔

کائنات میں قدرتِ خداوندی کی فعّالیّت جن اقدار کے مطابق سرانجام پاتی ہے۔ انہیں ''اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی'' کہتے ہیں۔ ان کی حقیقت کا اظہار بھی اللہ تعالیٰ نے خود ہی بذریعہ وحی کیا ہے۔ ہم ان سے اللہ تعالیٰ کے متعلق (اپنی ذہنی حدود کے اندر رہتے ہوئے) اندازہ کر سکتے ہیں۔ اللہ کی ہستی کے بارے میں ہم کچھ نہیں جان سکتے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی معرفت (جاننے پہچاننے) کا حکم نہیں دیا۔ اس پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے۔ خدا پر صحیح ایمان کے معنی ہیں ایسی ہستی کا ماننا جس کے اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا معاملہ اور ان کا الگ شعور، غیر ضروری صوفیانہ بکھیڑوں اور فلسفیاتی الجھنوں کا باعث ہے۔ ''ذات'' کا لفظ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں آیا۔ یہ عربی لفظ ''ذ'' کا مؤنث ہے اور اس کا معنی ''Personality'' ہرگز نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں یا صفات کا تصور بھی غیر قرآنی ہے۔ صفت کے معنی Attribution کے ہوتے ہیں یعنی (Ascribed as Belodging to a Person)۔ محدود ادراک کا حامل انسان اس لائق نہیں کہ ایک لامحدود ہستی کی از خود کسی صفت کا تعلق کرے یا اسے بیان کرے۔ (23:91)۔ اللہ اس سے بہت بلند ہے جو لوگ صفات بیان کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے بارے میں وہی بات کہنا مناسب ہے جو اس نے خود بتائی ہے۔ انسان از خود، خدا کے بارے میں نہ جان سکتا ہے اور نہ بتا سکتا ہے، سوائے اس کے کہ وہ اس کے تخیل کی پیداوار ہو۔ قرآنِ کریم نے اس کے لئے ''اسم'' کا لفظ اختیار کیا ہے جو ایک کائناتی عمل کے اظہار کے لئے ایک عمدہ انداز ہے۔

علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتابوں میں اگرچہ لفظ ''اللہ'' کو اسم ذاتی اور اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی کے لئے صفاتِ خداوندی کی ترکیب اختیار کی ہے (غالباً اس لئے کہ ان کے زمانہ میں یہ تراکیب اسلامی دنیا میں مروج تھیں) لیکن وہ ذات وصفات کی اصل حقیقت سے آگاہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب تبویب القرآن میں ''اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی'' کے تفصیلی تذکرہ کے بعد لکھا ہے:

''یہ ہیں وہ اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی جن سے خدا نے خود اپنا تعارف کرایا ہے۔ اس فہرست میں اور بھی اضافہ

ہوسکتا ہے۔یعنی خدا نے جتنے اور امور کی نسبت اپنی طرف کی ہے ان سے اس کی صفات کا تصور سامنے آتا ہے۔لیکن یہ صفات ہوں یا کوئی اور، ان میں اس نکتہ کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ یہ صفات اس پیمانے کی نہیں جس پیمانے کی صفات انسانوں میں ہوتی ہیں۔ انسانی صفات میں جذبات کا دخل ہوتا ہے اور خدا جذبات سے بلند، منزہ اور مبریٰ ہے۔ نیز انسانی صفات محدود پیمانے پر ہوتی ہیں اور خدا کی صفات لامحدود پیمانے پر۔اس لئے خدا نے کہا ہے کہ ان صفات کی رو سے ذہن انسانی خدا کے متعلق جو تصور قائم کرتا ہے، اس کی ذات اس سے بلند و بالا ہے۔محدود ذہن لامحدود کا تصور کر ہی نہیں سکتا۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۹۱﴾ (23:91) سے یہی مراد ہے۔''

علامہ غلام احمد پرویزؒ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتابوں، من و یزداں اور تبویب القران میں ''اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی'' کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے 99 (نُودنہ) ناموں کی ایک فہرست مروّج چلی آتی ہے اور آج کل چھپنے والے قرآنی نسخوں کی جلد کے اندرونی صفحات پر بڑے خوبصورت انداز میں درج ہوتی ہے لیکن ان کے ساتھ قرآنی حوالہ جات درج نہیں ہوتے۔''قرآن آسان تحریک لاہور'' نے سید شبیر احمدؒ کا ترجمہ دو رنگوں میں شائع کیا ہے۔اس کی جلد کے اندرونی دو صفحات پر 101 اسماء کی فہرست شائع ہوئی ہے جس میں قرآنی حوالے بھی درج ہیں۔ انہیں نے مروج ناموں سے دو (اَلْمُقِيْتُ، اَلرَّشِيْدُ) کا تذکرہ نہیں کیا اور دیگر چار اسماء شامل کر دیئے ہیں۔مزید یہ کہ کئی جگہ ان اسماء کے قرآنی حوالے بھی محلِ نظر ہیں۔(مُقیت کے لیے دیکھیں (4:85) اور الرشید کا لفظ قرآن مجید میں نہیں آیا۔)

اس پوزیشن کو مدنظر رکھتے ہوئے۔''اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی'' کی فہرست قرآن کریم کے حوالہ جات کے ساتھ مع ترجمہ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان حوالہ جات کو بالحصر پیش نہیں کیا گیا۔دو ایک مقامات کے حوالہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔یہ فہرست پیش خدمت ہے:

نمبر شمار	اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی	حوالہ قرآنی	ترجمہ
1۔	هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ	(59:22)	وہ اللہ جو نہیں کوئی اقتدار و اختیار والا مگر وہی۔
2۔	الرَّحْمٰنُ	(1:3، 59:22)	بے حد مہربان
3۔	الرَّحِيْمُ	(1:3، 59:22)	سدا رحم کرنے والا
4۔	اَلْمَلِكُ	(59:23)	بادشاہِ حقیقی
5۔	الْقُدُّوْسُ	(59:23)	نہایت مقدس
6۔	السَّلٰمُ	(59:23)	سراسر سلامتی والا
7۔	الْمُؤْمِنُ	(59:23)	امن دینے والا

8۔	الْمُهَيْمِنُ	(59:23)	نگہبان
9۔	الْعَزِيْزُ	(59:23)	سب پر غالب
10۔	الْجَبَّارُ	(59:23)	زبردست
11۔	الْمُتَكَبِّرُ	(59:23)	سب بڑائیوں کا مالک
12۔	الْخَالِقُ	(59:24)	تخلیق کا منصوبہ بنانے والا
13۔	الْبَارِئُ	(59:24)	درست کرنے والا
14۔	الْمُصَوِّرُ	(59:24)	صورت گری کرنے والا
15۔	الْوَاحِدُ	(39:4)	ایک ہی۔ اکیلا
16۔	الْقَهَّارُ	(39:4)	زبردست قوت کا مالک
17۔	الْغَفَّارُ	(39:5)	بہت حفاظت دینے والا
18۔	الْوَهَّابُ	(3:8)	بہت زیادہ عطا کرنے والا
19۔	الرَّزَّاقُ	(51:58)	رزق دینے والا
20۔	الْمَتِيْنُ	(51:58)	اپنے طور پر مستحکم اور مضبوط
21۔	الْفَتَّاحُ	(34:26)	سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا
22۔	الْعَلِيْمُ	(34:26)	ہر بات ہمیشہ سے جاننے والا
23۔	الْكَبِيْرُ	(13:9)	ہمیشہ سے بڑا
24۔	الْعَلِيُّ	(2:255)	بلند مرتبہ
25۔	السَّمِيْعُ	(17:1)	سدا سننے والا
26۔	الْبَصِيْرُ	(17:1)	سدا دیکھنے والا
27۔	اللَّطِيْفُ	(6:103)	نہایت باریک بین
28۔	الْخَبِيْرُ	(6:103)	ہمیشہ باخبر
29۔	الْعَظِيْمُ	(2:255)	سدا عظمت والا
30۔	الْغَفُوْرُ	(10:107)	بہت محفوظ رکھنے والا
31۔	الْكَرِيْمُ	(82:6)	ہر قسم کی بھلائی اور شرف والا

32۔	الرَّقِیْبُ	(5:117)	نگران اور حفاظت کرنے والا
33۔	الْحَکِیْمُ	(2:32)	صحیح اندازے اور قانون کے مطابق چلانے والا
34۔	الْوَدُوْدُ	(85:14)	بہت محبت کرنے والا
35۔	الْمَجِیْدُ	(85:15)	بڑی عظمت وشان والا
36۔	الْحَقُّ	(10:32)	سراپا حق
37۔	الْوَکِیْلُ	(3:173)	کارساز و بھروسہ والا
38۔	الْقَوِیُّ	(42:19)	بہت قوی
39۔	الْوَلِیُّ	(42:9)	حامی و مددگار
40۔	الْحَمِیْدُ	(22:64)	نہایت قابلِ تعریف
41۔	اَلْحَیُّ	(2:255)	زندۂ جاوید
42۔	الْقَیُّوْمُ	(2:255)	پوری کائنات کو سنبھالنے والا
43۔	الصَّمَدُ	(112:2)	بے نیاز، سب اس کے محتاج
44۔	الْقَادِرُ	(6:65)	قادرِ مطلق
45۔	الْاَوَّلُ	(57:3)	وہی اوّل
46۔	الْاٰخِرُ	(57:3)	وہی آخر
47۔	الظَّاھِرُ	(57:3)	وہی ظاہر
48۔	الْبَاطِنُ	(57:3)	وہی باطن
49۔	الْمُتَعَالُ	(13:9)	ہر حال میں بالاتر
50۔	التَّوَّابُ	(9:104)	بہت توبہ قبول کرنے والا
51۔	الْبَرُّ	(52:28)	بڑا ہی محسن
52۔	الْغَنِیُّ	(6:133)	احتیاج سے بے نیاز
53۔	الْمَوْلٰی	(8:40)	سرپرست و کارساز
54۔	الْاَعْلٰی	(87:1)	سب سے بلند۔ سب پر غالب
55۔	الْاَکْرَمُ	(96:3)	سب سے زیادہ شرف و بھلائی والا

56۔	الْوٰرِثُ	(15:23)	سب کا وارث
57۔	الْمُسْتَعَانُ	(21:112، 12:18)	جس سے مدد طلب کی جائے

ان اسماء کے علاوہ کچھ اسماء حالتِ نکرہ میں قرآنِ کریم میں آئے ہیں۔ ان مقامات پر اسم کو نکرہ لانا عظمت کے لیے ہے۔ ان سے قبل لامِ معرفہ (اَلْ) لگا کر انہیں معرفہ بنایا جا سکتا ہے:

1۔	اَحَدٌ	(112:1)	یکتا، یگانہ
1۔	حَلِیْمٌ	(2:263، 2:225)	برداشت کرنے والا
2۔	حَکَمٌ	(6:114)	فیصلہ کرنے والا
3۔	شَکُوْرٌ	(42:23، 35:30، 34)	بہت قدردان
4۔	شَاکِرٌ	(4:147، 2:158)	انسانی کوششوں کے بھرپور نتائج دینے والا۔
5۔	حَفِیْظٌ	(34:21، 11:57)	سدا نگہبان
6۔	حٰفِظٌ	(15:9، 12:64)	نگہبان
7۔	حَسِیْبٌ	(33:39، 4:6، 86)	حساب کرنے والا، نگرانی کرنے والا
8۔	مُّجِیْبٌ	(11:61)	جواب دینے والا، قبول کرنے والا
9۔	قَرِیْبٌ	(2:186، 11:61)	دور نہیں، نزدیک والا
10۔	وَاسِعٌ	(2:115)	قدرت اور فراخی والا
11۔	مُوسِعٌ	(51:47)	پھیلانے والا
12۔	شَهِیْدٌ	(22:17، 6:16)	ہر چیز ہمیشہ اس کے سامنے ہے، نگہبان، فیصلہ کرنیوالا
13۔	مَلِیْكٌ	(54:55)	ہمیشہ سے صاحب ملک
14۔	مُّقْتَدِرٌ	(18:45، 54:55)	اقتدار والا
15۔	مُنْتَقِمٌ	(44:16)	برے اعمال کا بدلہ دینے والا
16۔	عَفُوٌّ	(4:48)	غلطی کے مضر اثرات کو مٹانے والا، درگزر کرنیوالا
17۔	رَءُوْفٌ	(9:117)	دفع مضرت کر کے شفقت کرنے والا
18۔	هَادِیٌ	(25:31)	راہنمائی کر کے منزل پر پہنچانے والا
19۔	مُّقِیْتٌ	(4:85)	نگرانی و حفاظت کے ساتھ خوراک کا بندوبست کرنیوالا

20۔	مُحِیْطٌ	(3:120)	گھیرنے والا
21۔	مُنْذِرٌ	(44:3)	آگاہ کرنے والا (خطرات، واجبات سے)

درجِ ذیل ''اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی'' اسمآءِ معرفہ کے مضاف کے طور پر معرفہ متصور ہونگے:

1۔	رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ	(1:2)	سب جہانوں کا نشوونما دینے والا
	رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	(18:14)	آسمان اور زمین کا نشوونما دینے والا
	رَبُّ الْعَرْشِ	(23:116)	عرش کا مالک
	رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ	(73:9)	مشرق ومغرب کا نشوونما دینے والا
	رَبُّ الْعِزَّةِ	(37:180)	غلبہ وحفاظت کا نشوونما دینے والا
	رَبُّ هٰذَا الْبَیْتِ	(106:3)	اس گو (بیت الحرام کا رب)
	رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ	(6:164)	ہر چیز کا نشوونما دینے والا
	رَبُّ النَّاسِ	(114:1)	لوگوں کا رب
2۔	نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	(24:35)	آسمانوں اور زمین کو روشنی دینے والا
3۔	رَفِیْعُ الدَّرَجٰتِ	(40:15)	درجات کا ہمیشہ بلند کرنے والا
4۔	بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	(6:101)	آسمانوں اور زمین کا پہلے پہلے بنانے والا
5۔	فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	(12:101،6:14)	آسمانوں اور زمین کو الگ الگ کرنے والا
6۔	سَرِیْعُ الْحِسَابِ	(24:39،2:202)	حساب کو جلدی کرنے والا
7۔	شَدِیْدُ الْعِقَابِ	(40:3،2:211،2:196)	زبردست نتائج اعمال کا پیچھا کرنے والا
8۔	شَدِیْدُ الْمِحَالِ	(13:13)	سختی سے گرفت کرنے والا
9۔	غَافِرُ الذَّنْبِ	(40:3)	غلط اقدام کے نتائج یا اتہامات سے بچانا
10۔	قَابِلُ التَّوْبِ	(40:3)	توبہ قبول کرنے والا
11۔	فَالِقُ الْاِصْبَاحِ	(6:96)	رات کی تاریکیوں کو پھاڑ کر صبح کو نمودار کرنیوالا
	فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی	(6:95)	دانہ اور گٹھلی کو پھارنے والا
12	اِلٰهُ النَّاسِ	(114:3)	سب لوگوں کا اِلٰہ
13۔	مَلِكُ النَّاسِ	(114:2)	سب لوگوں کا بادشاہ

14۔	جَامِعُ النَّاسِ	(3:9)	سب لوگوں کو جمع کرنیوالا
15۔	اَسْرَعُ الْحٰسِبِیْنَ	(6:62)	بہت جلد حساب لینے والا
16۔	اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ	(12:64،7:151)	سب رحم کرنیوالوں سے بڑھ کر رحم کرنیوالا
17۔	اَحْکَمُ الْحٰکِمِیْنَ	(95:8)	سب حاکموں سے بڑا حاکم
18۔	مٰلِكُ یَوْمِ الدِّیْنِ	(1:3)	جزا کے دن کا مالک
	مٰلِكُ الْمُلْكِ	(3:26)	مالک بادشاہی کا
19۔	مُحْیِ الْمَوْتٰی	(4:39،30:50)	مردوں کو زندہ کرنے والا
20۔	ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ	(55:27)	عظمت وانعام والا
21۔	ذُو الْقُوَّةِ	(51:58)	صاحب قوت
22۔	ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ	(2:105،57:21)	بڑے فضل والا
23۔	ذُو الرَّحْمَةِ	(6:133،18:58)	رحمت والا
24۔	ذُو الْعَرْشِ	(85:15)	عرش والا
25۔	ذِی الطَّوْلِ	(40:3)	صاحبِ قوت واستطاعت
26۔	ذِی الْمَعَارِجِ	(70:3)	بلند مرتبوں والا
27۔	فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ	(85:16،11:107)	جو چاہتا ہے، اسے خوب کرنے والا

اس فہرست میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ یعنی جو باتیں اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کی ہیں، اس فعالیت سے ''اسم'' لایا جائے۔ جیسے:

تدبیر کرنے والا	1۔ اَلْمُدَبِّرُ	(آیت یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ (32:5) یُدَبِّرُ سے اَلْمُدَبِّرُ
باقی رہنے والا	2۔ اَلْبَاقِیْ	(آیت وَاللّٰهُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی (20:73) کی بنا پر)

رَبٌّ کے معنی ہیں نشوونما دینا۔ کسی چیز کو نئی نئی تبدیلیوں سے اس لئے گزارنا کہ وہ بتدریج نشوونما پائی ہوئی اپنی تکمیل تک پہنچ جائے۔ لفظ رَبٌّ اصل مصدر ہے جو استعارہ کے لئے اسم فاعل استعمال ہوا ہے (امام راغب) معنیٰ ہوگا نشوونما دینے والا۔

اسی طرح ''نُوْرٌ'' بھی مصدر ہے جو آیت (24:35) میں بطور اسم استعمال ہوا ہے جو فاعل کا فائدہ دیتا ہے۔ اس کا معنیٰ روشنی یا سراپا نور نہیں بلکہ ''روشن کرنے والا'' ہے اللہ نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق کیا اور بنائیں تاریکیاں اور روشنی (6:2)۔ اللہ تعالیٰ خود نور بمعنی روشنی نہیں بلکہ آسمانوں اور زمین کو روشن کرنے والا ہے۔ مخلوق کو خالق کے برابر نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ سائنسی تحقیق کے مطابق سورج سے جو برقی اور مقناطیسی لہریں نکلتی ہیں ان میں، گاما ریز ایکس ریز الٹراوائیلٹ زیر کے علاوہ روشنی کی شعاعیں (Visible spectrum) بھی نکلتی ہیں جو 380 تا 780 نانو میٹر فری کوئنسی کے درمیان پائی جاتی ہیں۔ باقی شعاعیں قابلِ بصارت نہیں۔

غنی کرنے والا	3۔اَلْمُغْنِیْ	(آیت وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰی وَاَقْنٰی (53:48) اور وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی (93:8) سے)
ابتدا کرنے والا	4۔اَلْمُبْدِئُ	(آیت اِنَّهٗ هُوَ یُبْدِئُ وَیُعِیْدُ (85:13) سے)
دوہرانے والا	5۔اَلْمُعِیْدُ	(آیت اِنَّهٗ هُوَ یُبْدِئُ وَیُعِیْدُ (85:13) سے)
مارنے والا	6۔اَلْمُمِیْتُ	(آیت وَاللّٰهُ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ (3:156) سے)
گن رکھنے والا	7۔اَلْمُحْصِیْ	(آیت وَكُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ كِتٰبًا (78:29) سے)
تعلیم دینے والا	8۔اَلْمُعَلِّمُ	آیات الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ○ (5-96:4) سے)
احسان کرنیوالا	9۔اَلْمَنَّانُ	(آیت لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ (3:164) سے)

قابلِ توجہ:

قرآن کریم میں بعض مقامات پر اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسے الفاظ آئے ہیں جو انسانی اعضاء مثلاً ہاتھ، آنکھ وغیرہ پر دلالت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ محض پیرایۂ بیان ہے جس میں یہ الفاظ استعارۃً آئے ہیں نہ کہ حقیقی معنوں میں مثلاً وَجْهُ اللّٰهِ (2:115)، اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ (3:73)، وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا (11:37) یہاں وَجْهُ سے مراد اس کا رُخ یَدٌ سے مراد قدرت اور اَعْیُنٌ سے مراد نگرانی ہوگا۔

اسی طرح موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو مخاطب ہو کر کہا گیا ہے: لَا تَخَافَآ اِنَّنِیْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی (20:46) ''ڈرو نہیں'' میں تم دونوں کے ساتھ ہوں میں سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔'' جب کسی فعل کو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت دی جاتی ہے تو وہی الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو انسانوں کے لئے بولے جاتے ہیں لیکن انسان ہر فعل میں اعضاء اور ذریعوں کا محتاج ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے لئے ان الفظ میں جو ذریعہ یا اعضاء ہوں، وہ منسوب نہیں ہوتے۔ صرف فعل کی آخری غرض مقصود ہوتی ہے۔ یہاں دیکھنے کے لیے انسان روشنی اور آنکھ کا محتاج ہے اور سننے کے لئے کان اور ہوا کا۔ مگر اللہ تعالیٰ کے لئے دیکھنے اور سننے کے ذرائع مفقود ہونگے اور دیکھنے اور سننے کی اصل غرض مراد ہوگی۔ اور یہی مفہوم ہوگا اس آیت کا کہ: وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ (3:77) کا جس میں کلام الٰہی کے لیے اور نظر کرنے کے لیے کلام اور نظر کو آلات و ذرائع درکار نہ ہونگے بلکہ ان افعال کی اصل غرض مراد ہوگی۔

ایسے ہی انسان کے قلب پر خاص حالات کے وارد ہونے سے غضب، ناراضگی خوش ہونے یا مذاق اڑانے کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ جب یہ الفاظ غضب، اَلسُّخْطُ، رضا یا رضوان یا استہزاء وغیرھا، اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہونگے تو اللہ تعالیٰ تو خوشی اور ناراضگی کے ان انسانی جذبات سے مبرّا اور بہت بلند ہے۔ جب اللہ کے لئے غضب کو نسبت ہوگی تو اس کا مطلب وہ ہیجانی کیفیت نہیں ہوگی جو انسان پر غصہ کی حالت میں طاری ہوتی ہے، بلکہ اس سے مراد اس کے قانون کی خلاف ورزی

کے فطری نتائج ہیں۔ اسی طرح ''اللہ کی خوشنودی'' کا مطلب اس کے قوانین کے مطابق چلنے کے خوشگوار نتائج ہیں۔ اَللّٰہُ یَسۡتَہۡزِئُ بِہِمۡ (2:15) کا معنی ہوگا کہ اللہ کے استہزاء میں، ہنسنا جو ذریعہ تھا، وہ مفقود ہوگا اور ذلیل کرنا یا استہزاء کی سزا دینا، جو اصل غرض تھی، وہ باقی رہ جائے گی۔ اس فرق کو مدنظر رکھنا بہت ضروری ہے۔

متفرقات:

1۔ اللہ تعالیٰ کائنات میں ہر جگہ ہے (6:3، 7:7، 57:4، 58:7)

2۔ اللہ تعالیٰ انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں اور اس کا نفس جو وسوسے ڈالتا رہتا ہے، اس سے واقف ہیں (دل میں گزرنے والے خیالات سے بھی آگاہ ہیں) (50:16)۔

3۔ انسانی آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں (6:103، 56:85)۔

4۔ اللہ کی ہر بات سچی ہے (4:87)۔

5۔ وہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا (3:8)۔

6۔ اللہ کے کلمات میں تبدیلی نہیں ہوتی (6:115، 9:34، 10:64، 18:27)

7۔ اللہ کی سنت میں تبدیلی نہیں ہوتی (17:77، 33:62، 35:43، 48:23)

8۔ ہر شے کے خزانے اللہ کے پاس ہیں۔ وہ ان میں سے بقدرِ معلوم (متعین پیمانوں) کے مطابق اسے اُتارتا رہتا ہے (15:21)۔

9۔ وہ سب کو کھلاتا ہے اور اسے کھانے کو نہیں دیا جاتا (6:14)

10۔ اس کی کوئی بیوی نہیں (6:101) اور نہ بیٹا (72:3)۔

11۔ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ ہی وہ جنا گیا (112:3)

12۔ اس کا کوئی ہمسر نہیں (112:4)

13۔ اس کی مثل بھی کوئی نہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو کسی مثال سے بھی سمجھا یا نہیں جا سکتا (42:11)

14۔ زمین کے تمام درخت قلمیں بن جائیں اور سمندر روشنائی (اس کے بعد سات سمندر اور ہوں) تو اللہ کے کلمات لکھنے میں یہ ختم ہو جائیں گے لیکن اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے (18:109، 31:27)

یہ ہے کچھ وضاحت اس آیۂ کریمہ کی کہ:

اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ؕ لَہُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی ۚ﴿۸﴾ (20:8)

ترجمہ: اللہ، اس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں۔ اسی کے ہیں اچھے نام۔

دوسری آیۂ مبارکہ جسے شروع میں بیان کیا گیا تھا، اس میں ہے کہ:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ (7:180)

ترجمہ: اور اللہ ہی کے ہیں سب اچھے نام۔ سو اسے پکارو انہی ناموں کے ساتھ۔۔۔

یہ پکارنا کیا ہے؟ قرآن کریم کی رُو سے ''خدا سے دعا'' کے معنیٰ ہیں، خدا کے قانون سے مدد چاہنا یعنی اس کی اطاعت سے اپنی کوششوں کے صحیح نتائج مرتب کرانا۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے متعدد مقامات پر واضح کر دیا ہے:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ (40:60) تمہارے نشوونما دینے والے نے کہا ہے کہ مجھے پکارو میں تمہاری پکار کا جواب دونگا۔ اس کے بعد ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ۝۶۰ (40:60) یقیناً جو لوگ میری حکومت اختیار کرنے سے سرکشی برتتے ہیں، وہ ذلیل وخوار ہو کر جہنم میں داخل ہوتے ہیں۔

آیت کے دونوں حصوں کو ملانے سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ''خدا کو پکارنے'' سے مراد اس کے احکام وقوانین کی محکومیت اختیار کرنا ہے اور خدا کی طرف سے اس پکار کا جواب ملنے سے مراد انسان کی سعی وکاوش کا ثمر بار ہونا ہے۔

دوسرے مقام پر اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ:

اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (32:15)

ترجمہ: ہمارے احکام پر ایمان لانے والے وہی لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے وہ احکام پیش کئے جاتے ہیں تو وہ سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں اور اپنے نشوونما دینے والے (کے پروگرام کو) درخورِ حمد وستائش بنانے کے لئے سرگرمِ عمل رہتے ہیں اور وہ ان احکام سے سرتابی نہیں کرتے۔

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۫ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۝۱۶ (32:16)

ترجمہ: وہ ان احکام کی تعمیل میں اس طرح سرگرمِ عمل رہتے ہیں کہ نیند تک کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ راتوں کو بھی جاگتے ہیں اور اس طرح اپنے رب کو دفعِ مضرت اور جلبِ منفعت کے لیے پکارتے ہیں۔ کیونکہ انہیں علم ہوتا ہے کہ اُن احکام کی تعمیل سے کیسے عمدہ نتائج مرتب ہونگے اور ان کی خلاف ورزی سے کس قدر تباہیاں آئیں گی۔ جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہوتا ہے'' وہ اسے (نوعِ انسانی کی بہبود کے لیے) کھلا رکھتے ہیں۔

یہی مفہوم آیات نمبر: 40:65، 42:26، 57-7:55 اور 2:186 کا ہے کہ خدا کے قانون کے مطابق قدم اٹھانا، خدا کو پکارنا یا دعا کرنا ہے اور اس کا خوش گوار نتیجہ مل جانا، دعا کا قبول ہو جانا ہے۔

آیت 7:180 کا دوسرا حصہ ہے:

وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ اور ان کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں میں ٹیڑھی راہ چلتے ہیں۔ انہیں اس کا بدلہ دیا جائے گا جو وہ کرتے تھے۔

الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى میں الحاد کی مثالیں کئی ہیں۔ مثلاً حاضر وناظر کا عقیدہ۔ یہ دونوں الفاظ عربی کے ہیں لیکن ''الْاَسْمَآءُ

الْحُسْنٰی ''میں شامل نہیں۔ حَضَرَ اور نَظَرَ سے اسم فاعل کے وزن پر ہیں جس کے معنی ہیں کہ پہلے نہ حاضر اور نہ ناظر تھے، اب آ گئے اور دیکھنے لگے۔ یہ صفت اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں۔ وہ ہمیشہ سے شہید اور بصیر ہیں۔ اسی طرح اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ یُحِبُّ الْجَمَالَ اس کی بھی کوئی قرآنی حیثیت نہیں۔ صوفیاء کا مشہور فقرہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ ایک الحادی نقرہ ہے۔ قرآنِ کریم نے عرفانِ الٰہی کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ اللہ پر ایمان کا مطالبہ کیا ہے۔

اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی کائنات اور انسانی دنیا میں قدرت کی فعّالیت کے اصول و اقدار کا واضح اظہار ہیں کہ اس کارگاہ میں معاملات و افعال کس طرح سرانجام پاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی معرفت بذریعہ وحی یہ حقیقت واضح کر دی ہے:

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۟ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ (18:29)

ترجمہ: فرما دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔ اس کرۂ ارض پر بستا انسان قدرت کے کس انداز عمل سے مستفید ہونا چاہتا ہے۔ وہ فیصلہ کر کے اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی میں سے مطلوبہ فعّالیت کو دعوت دے اور اسے اپنے آنگن میں اتارے۔ رحمت چاہتا ہے تو یاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ الرحمٰن والرحیم ہیں اور اصولِ رحمت یہ ہے:

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ (7:156)

رحمت تو اسے بہرحال میسر رہے گی۔ اگر خصوصی رحمتِ خداوندی چاہتا ہے تو تقویٰ شعاری اختیار کرے۔ رحمت اس کی آنگن میں اُترے گی۔

اگر انسان رحمت سے بے نیاز رہنا چاہے اور چاہتا ہے کہ زندگی کی شیرینیاں اس سے چھین جائیں تو اپنی مرضی سے خدائی قانون سے رُوگردانی کر لے اور ظلم کو شعار بنا لے۔ اللہ شدید العقاب کی طرف سے دُکھ کی کیفیت اس کے آنگن میں اُترے گی۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (40:22)

ترجمہ: یہ اس لئے کہ ان کے رسول روشن نشانیاں لیکر آتے، پھر وہ کفر کرتے تو اللہ نے انہیں پکڑا۔ بے شک اللہ زبردست سخت عذاب والا ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کا پروگرام یہ نہیں کہ انسان عذاب میں مبتلا ہو۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ (4:147)

ترجمہ: اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا۔ اگر تم حق مانو اور ایمان لاؤ۔

کیونکہ وہ اپنے بندوں سے کفر کا سرزد ہونا پسند نہیں کرتا۔

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۚ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ۭ (39:7)

اگر تم ناشکری کرو تو بیشک اللہ بے نیاز ہے تم سے اور اپنے بندوں کی ناشکری اسے پسند نہیں۔ اور اگر شکر کرو تو اسے

تمہارے پسند فرماتا ہے۔

اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی کا تعلق انسانوں سے یہ ہے کہ اپنے حسبِ حال تبدیلی کے لئے ان اسمآء کو دعوت دیں اور اپنی حالت میں حسبِ خواہش تبدیلی لائیں کیونکہ:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ ط (13:11)

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی

نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

کائنات میں جاری وساری غیر متبدل سنت اللہ اور اس کے ''اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی'' کی Appreciation حمد کہلاتی ہے اور ان سے آگاہی کے بعد انسانی رویہ ایک مؤمن کی حیثیت سے یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنی پوری صلاحیت خدائی پروگرام کی اطاعت اور مطابقت میں صرف کردے۔ یہی معنی ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (1:1) کے بعد اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4) کہنے کا۔

اللہ ہم سب کو اس کی توفیق دے۔

والسلام

اللہ دتا ایڈووکیٹ

کراچی کے احباب کے لیے ضروری اطلاع



اب طلوع اسلام کی تمام بکس اور ''طلوع اسلام'' میگزین مندرجہ ذیل پتہ پر مل سکتا ہے



محمد اقبال

48 سی، 21 کمرشل اسٹریٹ، میزانین فلور، فیز 2، ایکسٹینشن ڈی ایچ اے، کراچی رابطہ نمبر: 021-35395702, 0300-2275702

آصف جلیل

نالج اینڈ ویزڈم سنٹر، سلمان ٹاورز، آفس نمبر A-45، بالمقابل نادرا آفس، ملیر سٹی، کراچی رابطہ نمبر: 021-35421511,0333-2121992

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یاد اس کی آئی غم تازہ ہوا

(14 اگست 1947ء کی یاد میں)

گردشِ لیل ونہار کے حسابی اور میکانکی نظام کی رُو سے، چند دنوں کے بعد، ایک بار پھر 14 اگست سامنے آنے والی ہے۔ تغیراتِ احوال کی ستم ظریفی بھی عجیب حیرت فروش ہوتی ہے۔ واقعہ وہی ہوتا ہے لیکن اس کے تاثرات یکسر بدل جاتے ہیں۔ کبھی اس تقریب کی آمد آمد سے کیفیت یہ ہوجایا کرتی تھی کہ ؎

پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

اور اب یہ عالم ہے کہ: ؎

یاد اس کی آئی، غم تازہ ہوا
غم کسے کہتے ہیں؟ اندازہ ہوا

قوموں کی تاریخ میں اس قسم کے تغیرات کہیں صدیوں میں جا کر نمودار ہوتے ہیں، لیکن یہ شاید اس ''اٹامک ایج'' کا اثر ہے کہ ابھی کل کی بات ہے کہ ہم عید آزادی کا جشن منایا کرتے تھے، اور آج یہ حالت ہے کہ اس تقریب پر ہر قلبِ حساس پکار اٹھتا ہے کہ: ؎

یہ لُٹی لُٹی سی بہار کیوں ہے، کہاں وہ جانِ بہار ہے؟
یہ چمن سے کون چلا گیا، کہ کلی کلی کو فشار ہے!

لیکن اس سوگواریٔ بہار کے باوجود، طلوعِ اسلام اپنی اس ذمہ داری کو فراموش نہیں کرسکتا کہ ان بھولے ہوئے افسانوں کی یاد تازہ کراتا رہے۔

☆☆☆

تحریکِ پاکستان کے دوران کانگریس کے ہمنوا، بار بار قائداعظمؒ سے کہتے تھے کہ جب ہمارا مقصد بھی حصول آزادی ہے اور آپ کا مقصد بھی وہی، تو آپ کو ایک الگ تنظیم قائم کرنے اور جداگانہ تحریک چلانے کی ضرورت کیا ہے؟ آپ ہمارے ساتھ شامل ہوجایئے۔ ہم دونوں مل کر، انگریز کو یہاں سے نکال کر آزادی حاصل کرلیں گے اور نظامِ جمہوریت کی رُو سے عوام کی حکومت قائم کریں گے جس میں تمام باشندگانِ ملک کو یکساں آزادی حاصل ہوگی۔ اس کے جواب میں (پہلے علامہ اقبالؒ اور ان کے بعد) قائداعظمؒ ان سے کہتے تھے کہ لفظی طور پر تو آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن جہاں تک لفظ آزادی کے مفہوم کا تعلق ہے، وہ آپ کے اور ہمارے نزدیک ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ آپ کے نزدیک آزادی سے مفہوم یہ ہے کہ انگریز یہاں سے چلا جائے اور اہلِ ہند اپنی حکومت آپ قائم کرلیں لیکن ہمارے نزدیک آزادی کا مفہوم ومقصود اس سے مختلف ہے اور وہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا جب تک

مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت قائم نہ ہو جائے۔ (بالفاظِ دیگر) وہ ان سے کہتے تھے کہ تمہارے نزدیک ''آزاد مملکت'' کا قیام مقصود بالذات ہے اور ہمارے نزدیک' آزاد مملکت اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے جو مسلمانوں کی زندگی کا منتہیٰ ہے اور یہ منتہیٰ تھا اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی۔ یہی وہ نقطہ تھا جو درحقیقت مابہ النزاع تھا۔ ساری جنگ اسی محور کے..... گردلڑی گئی تھی اور اس میں فریقِ مقابل تھا نیشنلسٹ علماء کا گروہ۔ قائداعظمؒ کا دستِ ہُنر' ہندو کی شاطرانہ عیاری کا نقاب بڑی آسانی سے الٹ دیتا تھا۔ ان کا حسنِ استدلال' انگریز کے اعتراضات کا بھی بڑا مسکت جواب دیتا تھا لیکن علماء حضرات' طرح طرح کی مغالطہ آفرینیوں سے' عوام کے جذبات کو مشتعل کرتے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ نہ اقبالؒ عوامی سطح پر جذبات کی لڑائی لڑنا جانتے تھے' نہ قائداعظمؒ۔ اس زمانے میں' عوام کے دلوں میں انگریز کے خلاف نفرت اس قدر شدید تھی کہ اگر کسی کے خلاف کہہ دیا جاتا کہ وہ ''انگریز نواز'' ہے تو عوام ''ٹوڈی بچہ' ہائے ہائے'' سے اس کی زندگی اجیرن کر دیتے۔ انہوں نے اقبالؒ اور قائداعظمؒ دونوں کے متعلق یہ مشہور کر رکھا تھا کہ یہ انگریز کے پٹھو ہیں اور تحریکِ پاکستان انگریز کی سازش کی تخلیق ہے۔ (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) اس باب میں پیش پیش تھے۔ وہ کہتے تھے:

جو لوگ مسلمانوں کو اس میدانِ سیاست (یعنی کانگریسی میدانِ سیاست) میں اُترنے سے روک رہے ہیں اور متحدہ قومیت کی بھیانک صورت ظاہر کر کے نفرت دلا رہے ہیں' بلاشک وشبہ برطانیہ کی ایسی عظیم الشان خدمات سرانجام دے رہے ہیں جو اس کی افواج اور اسلحہ سے بھی انجام نہیں پاسکتیں۔

(پمفلٹ متحدہ قومیت اور اسلام، ص:76)

حتیٰ کہ انہوں نے حضرت علامہؒ کا نام لے کر کہا:

غرضیکہ جادوگرانِ برطانیہ نے اپنی ساحرانہ کارگزاریوں سے سرسید جیسے تجربہ کار' عقلمند شخص کو نہ صرف متحدہ قومیت سے بلکہ پالیٹکس اور آئینی جدوجہد سے بھی روکا اور اسی کے ذریعے سے مسلمانوں کو ہمیشہ سیاسیات سے الگ رکھوا کر بالکل نابلد اور ڈرپوک بنا دیا۔ پھر اگر ڈاکٹر اقبالؒ مرحوم اس سحر سے مسحور ہیں تو کیا تعجب ہے۔

(ایضاً' ص:74)

جب انہوں نے ''مسئلۂ قومیت'' کے سلسلے میں علامہ اقبالؒ کے ساتھ اپنی بحث میں اسی الزام کو دہرایا' تو انہوں نے اس کے جواب میں کہا تھا:

مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں بلکہ اولین مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہوسکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے لیکن اگر آزادئ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر اب ہے ایسا ہی رہے یا اس سے بدتر بن جائے' تو مسلمان ایسی آزادئ وطن

پر ہزار لعنت بھیجتا ہے۔ میں ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا' بولنا' روپیہ صرف کرنا' لاٹھیاں کھانا' جیل جانا' گولی کا نشانہ بننا' سب حرام سمجھتا ہوں۔ قطعاً حرام۔

(معرکۂ دین ووطن)

یہ الزامات ویسے ہی بڑے پوچ تھے۔ پھر واقعات ان کی اس طرح تردید کرتے گئے کہ کچھ عرصہ کے بعد یہ غیر مؤثر ہو گئے۔ اس کے بعد' ان حضرات نے اپنے ترکش کا آخری تیر نکالا اور کہا کہ مطالبۂ پاکستان کے حق میں جو یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اس مملکت میں مسلمان' اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں گے' تو یہ دلیل بڑی بودی اور مغالطہ آفریں ہے۔ آزاد ہندوستان میں' مسلمانوں کے لئے اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی۔ انہیں اعتقادات کی پوری پوری آزادی ہو گی۔ نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ جیسے احکام وفرائض کی ادائیگی میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہو گی۔ انہیں شخصی قوانین (Personal Laws) پر عمل پیرا ہونے کی آزادی ہو گی۔۔۔ یعنی ان کے نکاح' طلاق' وراثت وغیرہ سے متعلق معاملات شریعت کے مطابق طے ہوں گے۔ جب یہاں مسلمانوں کو شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے اس قدر آزادی ہو گی' تو پھر ایک الگ مملکت قائم کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ یہ ڈھونگ ہے۔ جناحؒ کے وکیلانہ حربے ہیں۔ ہندوستان میں اسلام کو کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔

ان کا یہ پراپیگنڈہ بڑا کارگر ثابت ہوتا تھا' اس لئے عوام (تو ایک طرف' عام تعلیم یافتہ) خواص تک کو یہ سمجھانا بڑا مشکل تھا کہ اسلام' اسی کا نام نہیں جسے یہ حضرات پیش کرتے ہیں۔ اسلام (بہ حیثیت نظامِ زندگی) اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے' جس کی ہندوستان میں تو ایک طرف' دنیا کی کسی غیر اسلامی مملکت میں بھی آزادی نہیں مل سکتی۔ اسی حقیقت کو اقبالؔ نے ان مختصر الفاظ میں بیان کیا تھا کہ: ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

یہ تھی بنیادی وجۂ نزاع اور بنائے اختلاف۔ آپ طلوع اسلام کے اس دور کے فائل اٹھا کر دیکھئے۔ آپ کو صفحات کے صفحات اسی بحث سے لبریز نظر آئیں گے۔ اصل یہ ہے کہ یہ سوال تھا بھی بڑا لطیف اور دقیق۔ مسلمان ہزار سال سے اسی اسلام کو حقیقی اسلام سمجھتا چلا آ رہا تھا جسے یہ (علماء) حضرات اسلام کے نام سے پیش کرتے تھے اور جس کی آزادی کی ضمانت ہندو دے رہا تھا۔ سوال یہ نہیں تھا کہ جس قدر اسلام' یہ حضرات پیش کرتے تھے' اسلام اتنا ہی نہیں۔ جو کچھ بھی اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا تھا' اس میں اس قدر غیر اسلامی (عجمی) عناصر شامل ہو چکے تھے کہ اصلی اسلام اس ملبہ کے نیچے دب کر رہ گیا تھا۔ مدفون اسلام کو اس ملبہ سے باہر نکالنا' بڑی کوہکنی اور خارہ شگافی چاہتا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے الٰہ آباد کے خطبہ میں کہا تھا کہ پاکستان کی اسلامی مملکت کے قیام سے مقصود یہ ہے کہ اس سے اسلام پر سے وہ نقش مٹا دیا جا سکے گا جو عربی ملوکیت نے اس پر ثبت کر رکھا ہے۔ اس نقش کو مٹانا (یا سعید حلیمؒ پاشا کے الفاظ میں' اس قشر کو کھرچنا) بڑا ہمت طلب مرحلہ تھا' بالخصوص جب مذہبی پیشوائیت پوری تندہی کے ساتھ اس کی مخالفت کرتی ہو اور اس کی پشت پر ہندو کی پوری تائید اور امداد موجود ہو۔

ان مخالفین میں اکثریت تو ان کی تھی جو دیانتداری (لیکن بربنائے جہالت) اسی اسلام کو حقیقی اسلام سمجھتے تھے جو امت میں متوارث چلا آ رہا تھا لیکن ایک عنصر ایسا بھی تھا جو اپنے مخصوص مقاصد کے پیش نظر اقبالؒ یا قائداعظمؒ کے پیش کردہ اسلام کی مخالفت کرتا تھا اور یہی طبقہ زیادہ مؤثر اور فعال تھا۔ وہ اسلام جسے یہ حضرات پیش کرتے تھے اس میں اپنے دائرے کے اندر ان کی اپنی حکومت قائم رہتی تھی یعنی قوم اپنے مذہبی معاملات کے لئے ان کے فیصلوں اور فتوؤں کی محتاج رہتی تھی۔ انہیں یہ اقتدار انگریز کے زمانے میں بھی حاصل تھا اور ہندو بھی اسے قائم رکھنے کی ضمانت دیتا تھا۔ اس کے برعکس، حقیقی اسلام میں ان کا یہ اقتدار (بلکہ جداگانہ وجود ہی) ختم ہو جاتا تھا یعنی اس اسلام میں تھیاکریسی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس باب میں نہ علامہ اقبالؒ نے کسی قسم کی مداہنت سے کام لیا، نہ قائداعظمؒ نے۔ انہوں نے نہایت واضح اور غیر مبہم الفاظ میں (بار بار) اس حقیقت کا اعلان کیا کہ پاکستان میں تھیاکریسی قطعاً نہیں ہو گی۔ علامہ اقبالؒ نے، اپنے خطبۂ الٰہ آباد سے بھی بہت پہلے، (مولانا) اکبر شاہ (نجیب آبادی) کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا:

آپ نے ٹھیک فرمایا ہے کہ پیشہ ور مولویوں کا اثر سرسید احمد خاں کی تحریک سے بہت کم ہو گیا تھا مگر خلافت کمیٹی نے اپنے پولیٹیکل فتوؤں کی خاطر ان کا اقتدار ہندی مسلمانوں میں پھر قائم کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں ہوا۔ مجھ کو حال ہی میں اس کا تجربہ ہوا ہے۔ کچھ مدت ہوئی میں نے اجتہاد پر ایک انگریزی مضمون لکھا تھا جو یہاں ایک جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔ انشاء اللہ شائع ہو گا۔ مگر بعض لوگوں نے مجھے کافر کہا۔ بہرحال اس تمام معاملے کے متعلق مفصل گفتگو ہو گی جب آپ لاہور تشریف لائیں گے۔ ہندوستان میں بالخصوص آج کل بہت سمجھ سوچ کر قدم اٹھانا ہو گا۔

(انوارِ اقبالؒ۔ شائع کردہ اقبالؒ اکیڈمی، ص:317)

انہوں نے 1932ء میں اپنے ایک بیان میں جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی 23 مارچ کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند فطری، مُلّاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی، بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی اُمنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔

(بحوالہ طلوعِ اسلام، مئی 1978ء)

یہ تو ان کے نثری بیانات کے اقتباس ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جو کچھ اور جس قدر ''مُلّا'' کے خلاف کہا ہے، وہ درحقیقت، مُلّا کے تصور کے اسلام اور تھیاکریسی کے خلاف جہاد ہے۔

اقبالؒ کے بعد قائداعظمؒ کی طرف آیئے تو انہوں نے بھی، لگی لپٹی رکھے بغیر، صاف صاف الفاظ میں کہا کہ تحریکِ

پاکستان کا اہم مقصد' قوم کو مذہبی پیشوائیت کے رجعت پسندانہ اسلام کے چنگل سے نجات دلانا ہے۔ انہوں نے 5 فروری 1938ء کو مسلم یونیورسٹی' علی گڑھ کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے' نوجوان طالب علموں سے کہا:

مسلم لیگ نے کم از کم ایک کام تو کر دیا ہے اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں مسلمانوں کے رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے اور اس خیال کو عام کر دیا ہے کہ جو لوگ خود غرضی کا مفاد پرستانہ کھیل' کھیل رہے ہیں' وہ قوم کے غدار ہیں۔ اس نے بلاشک و شبہ تمہیں اس ناخوش آئند و غیر مطلوب عنصر کی جکڑ بندیوں سے آزاد کر دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔

(تقاریر قائداعظمؒ حصہ اول' ص:48)

انہوں نے' 11 اپریل 1946ء کو دہلی میں' مسلم لیجسلیٹرز کنونشن کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین کیا ہے۔ ہمارا نصب العین تھیاکریسی نہیں۔ ہم تھیاکریٹک اسٹیٹ بنانا نہیں چاہتے۔

(تقاریر، جلد دوم' ص:386)

انہوں نے تشکیل پاکستان کے بعد بھی' اس حقیقت کو علی الاعلان واضح کیا تھا کہ پاکستان میں مذہبی پیشواؤں کی حکومت نہیں ہوگی۔ انہوں نے' فروری 1948ء میں' اہل امریکہ کے نام اپنے براڈکاسٹ میں کہا تھا:

پاکستان کی مجلسِ آئین ساز نے ابھی پاکستان کا دستور مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کی آخری شکل کیا ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل' ص:65)

علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی ان تصریحات کے بعد' یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ علماء حضرات' مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کیوں کرتے تھے۔ یہ اسلام کا سوال نہیں تھا۔ ان کے ذاتی اقتدار کا سوال تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ اقتدار جو انہیں مسلمان سلاطین کی ہزار سالہ سیکولر حکومت کے تحت حاصل رہا۔ جسے انگریز نے بھی اپنے عہدِ حکومت میں برقرار رکھا اور جسے علیٰ حالہٖ رکھنے کی ضمانت ہندو دے رہا تھا' پاکستان میں (صحیح معنوں میں) اسلامی حکومت میں' نہ صرف یہ کہ وہ ان سے چھن جائے گا' بلکہ ان کا جداگانہ تشخص بھی باقی نہیں رہے گا۔ بنابریں' فطری طور پر ان کی خواہش اور کوشش یہی تھی کہ پاکستان وجود میں نہ آنے پائے۔

اقبالؒ یا قائداعظمؒ نے یہی نہیں کہا تھا کہ پاکستان میں تھیاکریسی نہیں ہوگی۔ انہوں نے مثبت طور پر یہ بھی واضح کر

دیا تھا کہ اس مملکت میں، حکومت قرآن کے مطابق قائم ہو گی۔ علامہ اقبالؒ کا تو خیر سارا کلام اسی نقطہ کی وضاحت ہے کہ 'اسلامی حکومت' قرآن کی حکمرانی کا نام ہے جو حسبنا کتاب اللہ' کہنے والوں کے ہاتھوں متشکل ہوتی ہے' قائداعظمؒ نے بھی اس باب میں کسی قسم کا شک وشبہ یا ابہام نہیں رہنے دیا تھا۔ حیدرآباد (دکن) میں ان کا وہ اعلان' جو طلوع اسلام کے صفحات پر بار بار شائع ہوتا چلا آ رہا ہے' اس حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے فرمایا تھا:

اسلامی مملکت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

(اورینٹ پریس' بحوالہ روزنامہ انقلاب' لاہور' مورخہ 8 جنوری 1942ء)

اس پر وہاں کے طلباء نے (جنہیں یہ انٹرویو دیا گیا تھا) کہا کہ جب یہ صورت ہے تو پھر مسلم لیگ اپنی تحریک کی مذہبی تعبیر وتشریح کیوں نہیں کرتی۔ اس کے جواب میں' قائداعظمؒ نے فرمایا تھا:

دِقت یہ ہے کہ جب اس جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت بغیر اس بات کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت' تقسیمِ عمل اور اس کے اصلی حدود کیا ہیں' ان امور کو صرف چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے اور اپنے حلقہ سے باہر' اہلیت و استعداد کے باوجود' مجھ میں یا آپ میں' یعنی اپنے سوا کسی اور میں' اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی۔ حالانکہ اس منصب کی بجا آوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے' انہیں مَیں ان مولوی صاحبان میں (الا ماشاء اللہ) نہیں پاتا اور (مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔

☆☆☆

ان علماء نے تحریکِ پاکستان کے دوران اپنی مخالفت مسلسل جاری رکھی لیکن جب ان کی مخالفت کے علی الرغم پاکستان وجود میں آ گیا تو انہوں نے ایک دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔ یہ ہجوم کر کے پاکستان آ گئے۔ واضح رہے کہ ان علماء میں گنتی کے چند ایسے تھے جنہوں نے تحریکِ پاکستان کا ساتھ دیا تھا۔ ان کی معتدبہ اکثریت اس کے مخالفین کی تھی۔ یہ پاکستان آ گئے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے مطالبہ شروع کر دیا کہ:

(i) پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے۔

(ii) لہٰذا' یہاں اسلامی قوانین نافذ کرو۔

(iii) اسلامی احکام وقوانین کا علم اربابِ حکومت کو نہیں' علماء کو ہے۔ لہٰذا زمامِ اقتدار علماء کے ہاتھ میں دو۔

یعنی ہندوستان میں رہتے ہوئے اگر ان کا اقتدار' نماز' روزہ یا شخصی قوانین تک محدود رہنا تھا' تو یہاں ان کے عزائم پوری کی پوری حکومت پر قبضہ کرنا تھا۔ جب مودودی مرحوم

سے کہا گیا تھا کہ اسلامی نظام یا دستور مرتب نہیں ہو رہا' تو انہوں نے کہا تھا کہ اقتدار ان کے ہاتھ میں دو جو جانتے ہیں کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔ پھر دیکھو یہ نظام اور دستور کس طرح مرتب نہیں ہوتا!

اگر اقبالؒ یا قائداعظمؒ زندہ ہوتے تو وہ ان کے اس مطالبہ کا جواب ویسے ہی دیتے' جیسے وہ تحریکِ پاکستان کے دوران دیا کرتے تھے۔۔۔ یعنی وہ قرآنی دستور و نظام مرتب کر کے دے دیتے۔ لیکن (قوم اور اس مملکت کی بدقسمتی تھی کہ) وہ اس سے پہلے ہی دنیا سے چلے گئے۔

ہم گذشتہ اربابِ اقتدار میں سے کسی کی بھی مدافعت نہیں کرنا چاہتے' لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ جانتے تھے کہ جسے یہ حضرات اسلامی قوانین کہہ کر پکارتے ہیں' وہ اس دور میں ناممکن العمل ہیں۔ لہٰذا' وہ اس مطالبہ کو منظور نہیں کرتے تھے۔ اس سے انہیں' ان کے خلاف پراپیگنڈہ کرنے کا نہایت عمدہ موقعہ ہاتھ آ جاتا تھا۔۔۔ اور پراپیگنڈہ کی جس قدر منظم اور مؤثر مشینری ان حضرات کے پاس ہے' دنیا کی کوئی حکومت بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ آپ ذرا اس پر نگاہ ڈالئے کہ پاکستان کے ہر گاؤں' ہر قصبہ' ہر قریہ' ہر شہر اور اس کی ہر گلی اور ہر محلہ میں مسجد (بلکہ مسجدیں) موجود ہیں۔ ان میں' روزانہ پانچ مرتبہ اور ہر ہفتہ' کسی اعلان' اشتہار یا دعوت کے بغیر لوگ از خود جمع ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا' جس بات کو یہ پھیلانا چاہیں وہ ایک دن میں' بیک وقت' ملک کے کونے کونے تک پہنچ جاتی ہے۔ سوچئے کہ اس جیسی منظم پراپیگنڈہ کی مشینری دنیا کی کسی حکومت کے پاس بھی ہے؟ اس مشینری کی رُو سے یہ حضرات ہر حکومت کے خلاف پراپیگنڈہ کرتے رہے کہ اربابِ اقتدار ملحد ہیں۔ بے دین ہیں۔ فاسق و فاجر ہیں۔ یہ احکام شریعت نافذ نہیں کرنا چاہتے۔

ان کا مطالبہ کس طرح ناممکن العمل تھا اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ یہ آج تک پکارتے چلے آ رہے ہیں کہ 1951ء میں' ملک کے تمام فرقوں کے نمائندہ علماء نے ایک متفقہ منشور شائع کیا تھا جس میں اسلامی نظام اور شریعت کی وضاحت کی گئی تھی اور اس کے مطابق نظامِ حکومت قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس منشور میں ''متفق علیہ'' مطالبہ یہ تھا کہ ملک کے قوانین ''کتاب و سنت'' کے مطابق مرتب ہونے چاہئیں۔ بیس سال تک یہ حضرات اس مطالبہ کو دہراتے رہے اور ہر حکومت کو کوستے رہے کہ یہ لوگ ''کتاب وسنت'' کے مطابق قوانین مرتب نہیں کرتے۔ بیس سال کے مسلسل پراپیگنڈہ کے بعد' اس منشور پر دستخط کرنے والوں میں سے (اگر سب سے زیادہ مشہور نہیں' تو مشہور تر) شخصیت' سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے اعتراف اور اعلان کیا کہ کتاب وسنت کے مطابق پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں۔

یعنی جب اربابِ حکومت اس مطالبہ کو ناممکن العمل کہتے تھے تو انہیں ملحد و بے دین کہا جاتا تھا۔ لیکن جب مودودی (مرحوم) نے اسے ناممکن العمل قرار دیا تو ان میں سے کسی نے ان کے خلاف ایک لفظ تک نہ کہا۔ اس لئے کہ سب جانتے تھے کہ مودودی (مرحوم) نے ٹھیک کہا ہے۔ یہ مطالبہ واقعی ناممکن العمل ہے!

جب مودودی (مرحوم) سے پوچھا گیا کہ اگر ''کتاب وسنت'' کے مطابق کوئی متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو

سکتا تو پھر کیا کیا جائے؟ انہوں نے کہا کہ ملک میں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے۔ (حالانکہ اس فقہ کہ وہ خود ''منجمد شاستر'' قرار دے چکے تھے)۔ چونکہ مطالبہ پاکستان کی مخالفت کرنے والے علماء کی اکثریت فقہ حنفی کی پابند تھی، اس لئے انہوں نے اس تجویز کا بڑھ چڑھ کر استقبال کیا۔ اس طرح یہاں وہ تھیا کریسی مسلط ہوگئی جسے ختم کرنے کے لئے حصولِ پاکستان کے لئے جدوجہد کی گئی تھی اور یوں ان علماء کی وہ شکست جو انہیں تشکیلِ پاکستان کی رُو سے اٹھانی پڑی تھی، مبدل بہ فتح ہوگئی۔ اس سے انہیں کوئی غرض نہیں کہ یہ (ہزار سال پہلے کے انسانوں کے وضع کردہ احکام) ممکن العمل بھی ہیں یا نہیں، اور جو فرقے اس فقہ کو اسلامی تسلیم نہیں کرتے، ان کا ان کے خلاف کیا ردِعمل ہوگا اور ملک کی سالمیت پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ ایران کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

یہ ہیں وہ حقائق جن کی روشنی میں ہم نے کہا تھا کہ وہ یومِ آزادی، جس کی آمد آمد کبھی روزِ عید سے بھی زیادہ وجۂ شادمانی ہوتی تھی، اب اس کی کیفیت یہ ہے کہ ؎

یاد اس کی آئی، غم تازہ ہوا
غم کسے کہتے ہیں، اندازہ ہوا

بایں ہمہ، ہماری اب بھی یہی دعا اور کوشش ہے کہ خدا اس خطۂ زمین کو قائم ودائم اور مستحکم و پائندہ رکھے، کہ اس کے وجود کے ساتھ، قرآنی نظام کی امیدیں وابستہ ہیں۔

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں تیرا نام رہے
غیر ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

لہٰذا، ہم اس ماہِ صیام میں یومِ آزادی کا بہ صمیمِ قلب استقبال کرتے ہیں۔

کوئی دعویٰ نہیں

کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں۔ میں نے قرآن کریم کو اپنی بصیرت کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اسی فکر پر اس تحریک کی بنیاد رکھی ہے میری یہ فکر میری تحریروں میں محفوظ ہے اور انہی تحریروں کا میں ذمہ دار ہوں۔ اگر کوئی شخص کوئی ایسی بات میری طرف منسوب کرے جو میری تحریروں میں نہیں، تو اس بات کو نہ کوئی سند حاصل ہوسکتی ہے نہ میں اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہوں، خواہ وہ شخص مجھ سے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو۔ میں نے اس وارننگ کو اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ سلسلہ ابھی سے شروع ہوگیا ہے۔ اس زمرہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو باتیں تو اپنی طرف سے کرتے ہیں، اور منسوب کر دیتے ہیں انہیں تحریکِ طلوع اسلام کی طرف، وہ دانستہ ایسا کرتے ہوں یا نادانستہ، دونوں صورتوں میں اس سے تحریک کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ تحریک کے لیے سند صرف وہ تحریریں ہیں جو اس کی طرف سے شائع ہوئی ہیں، نہ کہ زبانی روایات خواہ راوی کتنے ہی ثقہ کیوں نہ ہوں میری درخواست ہے کہ آپ احباب اس کا بھی خاص طور پر خیال رکھیں۔

(پرویزؔ، سالانہ کنونشن، 17 تا 20 مارچ 1966ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(قسط نمبر29)

دو قومی قرآنی نظریہ پر مطالبۂ پاکستان

آٹھواں باب:

انسانی ذات کی نشوونماء کا حدِ بشریت میں نمودِ صفاتِ خداوندی سے قُرب کا معیار

فکرِ جدید کی رو سے انسان محض مادی عناصر کا مرکب نہیں جس میں ہر آن تغیر واقع ہوتا رہتا ہے بلکہ اس کے اندر ذات (روح اور عقل) بھی ودیعت کی گئی ہے جو مستقل ہے اور اسے خارجی تغیرات سے غیر متاثر رکھا جا سکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ ذات جو مضمر حالت میں انسان کے اندر پیدائش سے موجود رہتی ہے اس حالت میں ہمیشہ رہتی ہے یا اس میں نشوونما بھی ہوتی ہے جس کی تکمیل سے اس میں پختگی آتی جاتی ہے۔ اس کو بالفاظ دیگر اس کا ارتقاء کہا جاتا ہے۔ عصرِ حاضر کے مفکرین اب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسانی ذات میں نشوونما کے امکانات ہوتے ہیں اور اِس کی نشوونما اور تکمیل ہی درحقیقت مقصودِ زندگی ہے۔ ہم اِنسانی ذات اور اِس کی نشوونماء کے تصور کی وضاحت کو اپنے دور کی عِلمی دنیا اور خصوصی طور پر مغرب کے مفکرین میں بھی یوں پاتے ہیں۔

انسانی ذات اور اِس کی نشوونماء پر اہم مفکرینِ مغرب کی وضاحت:

اِنسانی ذات کی نشوونماء کے متعلق مغربی مُفکرین کے مؤقف کو جاننے کے لئے اُن کے اہم مفکر اوسپینسکی اگر جیف کے الفاظ میں وضاحت پیش کرتے ہیں کہ:

> ''انسانی ارتقا سے مفہوم یہ ہے کہ ذات کے ان قویٰ اور ممکنات کا نشوونما پانا جو از خود نشوونما نہیں پا سکتیں یعنی جن میں میکانکی طور پر بالیدگی پیدا نہیں ہوتی۔ صرف اس نہج کی نشوونما، صرف اس انداز کی بالیدگی انسان کی حقیقی ارتقاء کہلا سکتی ہے اس کے علاوہ اور کسی چیز کو انسانی ارتقاء نہیں کہا جا سکتا ہے۔''

راشڈل نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ "تحصیل ذات کی اصطلاح جو اکثر اخلاقی زندگی کا مقصد ہے اس سے ذات کو حقیقی بنانا مراد نہیں ہو سکتا کیونکہ ذات تو پہلے ہی حقیقی ہے۔ اس سے ذات کو کامل بنانا مراد لے سکتے ہیں اور عموماً اس سے یہی مفہوم مراد ہوتا ہے۔ افعال کے سوچے سمجھے انتخاب اور غائتوں کی ارادی تلاش و جستجو ہی انسان کے کمال حاصل کرنے کا راستہ ہے، بجائے اس کے انھیں ارتقا کے فطری رویے پر چھوڑ دیا جائے۔

ایک دوسرے مُفکر گرین کے نزدیک انسان کی زندگی اور اخلاق کو سمجھنے کے لیے اس پہلو پر زور دینا چاہیے جو اس کا امتیاز ہے۔ یعنی خود شعوری جو اسے حیوان سے الگ کرتی ہے۔ اس لیے اس خوبی کو جس حد تک ترقی دی جائے گی وہ انسانی کمال ہوگا اور اس سے اخلاق کی برتری ہوگی۔ جانوروں میں اشتہا کو پورا کرنا ان کی زندگی ہے لیکن انسان میں عقل، ادراک اور جذبہ ہے جو کہ اس کی ذات سے متعلق ہے لہٰذا انسان اپنی ذات کو ترقی دے اور اسے مکمل کرے۔

گرین کے مطابق انسان جسمانی لذتوں سے آگے بڑھ کر ذہنی اور روحانی (تکمیل ذات کی) مسرتوں کی بھی تلاش کرتا ہے۔ حقیقی اور مستقل مسرتیں معاشرتی زندگی میں ظاہر ہوتی ہیں۔ تکمیل ذات بطور فرد حاصل نہیں ہوتی بلکہ معاشرے میں رہ کر، اس کا حصہ بن کر ہوتی ہے۔ انسان معاشرے میں اپنی زندگی گزارتا ہے اور اپنی مسرتوں کو معاشرے میں پورا کرتا ہے۔ غرض اس کی پوری زندگی معاشرے کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ گرین انفرادی خیر کو عالمگیر خیر کا ایک حصہ سمجھتا ہے۔

گرین تکمیل نفس کو خیر مشترک کہتا ہے۔ جو وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ میل و جول سے حاصل کرتا ہے۔ انسان کی ذات کی تکمیل معاشرے میں اپنے فرائض پورے کرنے سے ہوتی ہے۔ انسان اپنی خواہشات کو پورا کرتا ہے۔ ساتھ ہی دوسرے لوگوں کی مدد کر کے اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کی انفرادی، خیر، عالمگیر خیر (اور جسے گرین خیر مشترک کے نام سے پکارتا ہے) کا حصہ ہے۔ برفو اس ضمن میں اپنا مؤقف پیش کرتا ہے کہ:

''انسانی فکر کو فطرت کی طرف سے عائد کردہ مشکلات و موانع کے خلاف جنگ نہیں کرنا پڑی۔ اگر کبھی ایسا اتفاق ہوا ہے بھی تو اِنسانی فکر نے اس کا حل نکال کر کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اس کی حقیقی جنگ تو اس کے خود ساختہ موانع کے خلاف رہتی ہے۔ انہی غیر فطری اور مصنوعی موانع نے اس کی تمام تخلیقی قوتوں کو مفلوج کر دیا ہے۔ یہ خود ساختہ غیر فطری موانع وہی ہیں جنہیں ہر انسان نے اپنے آپ کو نوع انسانی سے الگ جداگانہ ہستی تصور کر کے، انسان اور انسان کے درمیان حائل کر رکھا ہے۔''

اب انسانی فکر کا رجحان بھی اسی طرف مبذول ہو رہا ہے کہ دنیا کی فلاح و بہبود کا راز وحدت معاشرہ پر مبنی حکومت میں ہے۔ یعنی ساری دنیا کو ایک مرکز کے تابع لے آنے کا۔ جب ساری دنیا پر ایک ہی قانون خیر مشترک اور ایک ہی معاشرہ ہوگا تو تضادات اور نزاعات یعنی شر کا خود بخود خاتمہ ہو جائے گا۔ ذات کی نشوونما کرتے ہوئے حصولِ کمال معاشرہ کے اندر رہ کر ہی مُمکن ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اپنی انا کی تکمیل چاہے تو وہ معاشرے ہی کو تکمیل انا (خودی) کا ذریعہ سمجھے۔ وہ معاشرے کا زیر بار احسان ہے کہ وہ اس کا حق کسی طرح ادا کر ہی نہیں سکتا۔ بجز اس کے کہ وہ معاشرے کی بھلائی چاہے، یعنی اپنے آپ کو ''خیر مشترک'' سے وابستہ کر کے ہی وہ معاشرے کا حق ادا کر سکتا ہے۔ راشڈل نے بھی اس کی وضاحت میں لکھا ہے کہ:

یہ معاشرہ ایسی کیفیت کا نام ہے جس میں ہر فرد معاشرہ کی بہبود کے لیے وہی کچھ کرے جو معاشرہ فرد کی بہبود کے لیے کرتا ہے۔

انسانی ذات کی نشوونماء کے حصول میں قرآن کا بنیادی اصولِ بقاء وارتقا:

قرآن ذات کی نشوونماء کے لئے بنیادی اصول یوں پیش کرتا ہے کہ اِس کے حصول کا طریقِ کار یہ ہے کہ:

الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ (92:18)

مفہوم: ''نشوونما اس سے ہوتی ہے، جو اپنے مال کو دوسروں کی بہبود کے لئے دیتا ہے۔''

اس آیت میں مالہ میں عموماً مَالَ اور ہٗ کی ترکیب کے تحت ''اس کا مال یا ملکیت'' کا مفہوم لیا جاتا ہے۔ مالہ کی ایک دوسری ترکیب بھی ہے جو مالَہٗ ہے۔ مَالَہٗ کے تحت پہلے مفہوم کو وسعت دے کر اس میں بشمول مال کے، دیگر وہ تمام صلاحیتیں بھی شامل ہو جاتی ہیں، جو فرد کو خدا کی طرف سے بطورِ نعمت و فضل عطا ہوتی ہیں۔ قرآن کی عمومی تعلیم کو پیش نظر رکھا جائے تو دوسرا مفہوم زیادہ موزوں نظر آتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ دوسروں کی بہبود کے لئے ذات کی نشوونما کا نظریہ وہی کہلاتا ہے، جو انفرادی مفادِ خویش کی بجائے، کلی انسانیت کے مفاد کا حامل ہو۔ قرآن ایسے ہی راستے کو بقاء کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما کے لیے قرآن جو پروگرام تجویز کرتا ہے اسکی رو سے یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک فرد اپنی ذات کی تکمیل میں ایسا جذب ہو جائے کہ دوسروں کی نشوونما کو نظر انداز کر دے۔ اس کا پروگرام ہی یہ ہے کہ جس قدر کوئی فرد دوسروں کی نشوونما کرتا ہے، اسی قدر اسکی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ قرآن نے انسان کو بطور فرد نعماءِ خداوندی کا مالک بنا کر اِن نعماء کو اپنے اور اولاد کے لئے جمع کر لینے کی ہدایت نہیں کی۔ اس کے برعکس اسے اس کی تحویل میں دیتے ہوئے اور امین کا درجہ دیتے ہوئے اسے فی سبیل اللہ کھلا رکھنے کی یعنی العفو کی ہدایت کی ہے۔ اس سے مقصد نوع انسانی کی بہبود کا سامان کرنا ہے نہ کہ انسان کے صِرف جبلی تقاضوں پر مبنی خواہشات کا اتباع۔ کائنات کے ثبات اور بقاء کے لئے یہی اصول کلّی بیان کیا جاتا ہے کہ جو انفرادی مفاد خویش کی بجائے، کُلی انسانیت کے مفاد کا حامل ہو۔

وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْكُثُ فِی الْاَرْضِ ؕ (13:17)

مفہوم: ''جس نظام کا مطمحِ نگاہ نوع انسانی کی منفعت ہوتا ہے، وہ باقی رہ جاتا ہے۔''

یہ ہے وہ محور، جس کے گرد قرآن کا نظریہ ارتقاء کا تصور اجاگر ہوتا ہے۔

مغربی سیاست دانوں نے قانون ارتقاء ''بقاء للاصلاح'' بتایا یعنی بقاء اسی کے لئے ہے جس میں صلاحیّت ہے۔ مگر قرآن نے "بقاء للانفع" بتایا یعنی بقاء انسانیّت کی منفعت میں ہے۔ اصلح اپنی ذات کے لئے ہوتا ہے اور انفع عالمگیر انسانیّت کے لئے ہوتا ہے۔ زندگی کے طبیعی مرحلے میں ارتقاء کے طبیعی موانعات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر طبیعی موانعات نہ ہوتے تو زندگیاں پروان نہ چڑھ سکتیں کیونکہ ارتقاء کے لئے موانعات کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اب جبکہ انسانی زندگی کو غیر مرئی ذات عطا ہوئی تو غیر طبیعی ذات کے ارتقاء کے لئے غیر طبیعی موانعات کی بھی ضرورت تھی۔ خدا نے انسان کو ذات عطا کرنے کے ساتھ ہی طبیعی موانعات کو تو انسان کے لئے مسخر کر دیا ہے، اور انسانی ذات کے ارتقاء کے لئے، خدا نے شیطان کی عقلِ خود بیں کی صورت میں غیر مرئی موانعات کا انتظام بھی کر دیا، تاکہ انسانی ذات اِس پر قابو پاتے ہوئے ارتقائی مراحل طے کر سکے۔ اگر طبیعی زندگی میں طبیعی موانعات نہ ہوتے، تو زندگی انسانی پیکر میں نہ پہنچ پاتی، بلکہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ پاتی۔ اسی

طرح اگر شیطان نہ ہوتا تو انسان، زندگی بعد زندگی میں جنّت کا مستحق ہونے کے لئے ذات کی نشوونماء کبھی نہ کر پاتا۔ انہی جنّتی زندگی کے مستحق افراد پر مبنی قرآن ایک ایسا معاشرہ متشکل کرتا ہے جس میں ہر فرد دوسرے افراد کی نشوونما کے لیے مصروف سعی وعمل رہتا ہے اور دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتا ہے۔ وہ یہ سب کچھ فرض سمجھ کر اِس لیے کرتا ہے کہ اس کا ایمان ہے کہ اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوگی اور یہی اس کی زندگی کا منشاء ومقصود ہے۔

قرآن نے انسانی ذات کی انتہائی سمت کا تعین، اس کی الیہ، خدا کی منزل کی طرف اشارہ کیا ہے کہ:

وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴿۴۲﴾ (53:42)

مفہوم: ''تمہاری منتہٰی، تمہاری منزل تمہارے رب کی طرف جاتی ہے۔''

منتہٰی سے انسانی ذات کا خدا کے اندر جذب ہونے اور فنا ہونے کا تصوّر غیر قرآنی ہے۔ انسان کی معراج یہ ہے کہ وہ خدا کے سامنے کھڑا ہو کر بھی اپنے آپ کو "میں" کہے اور ایسا تب ہی کہہ سکے گا، جب انسان خدا کی صفات کو اپنے اندر منعکس کرتا چلا جائے۔ یہاں خدا کے رنگ میں رنگتے چلے جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اندر صفاتِ خداوندی کو منعکس، اور اناءِ مطلق کو، اپنے اندر جذب کرتا جائے۔

انسانی ذات کی نشوونماء کے حصول میں صِفاتِ خداوندی سے قُربِ کا قرآنی نظریہ:

انسانی ذات کی نشوونماء کے حصول میں صِفاتِ خداوندی سے انسانی اعمالِ صالح کی رفاقت کے قرآنی نظریہ کی وضاحت ہم درجِ ذیل آیت کے قدرے تفصیلی تجزیہ سے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ؕ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ؕ (35:10)

مفہوم: ''جو قوم، قوّت اور غلبہ، عزّت وتکریم، حاصل کرنا چاہتی ہے، تو وہ سمجھ لے کہ غلبہ اور قوّت سب، صِفاتِ خداوندی کے اتّباع سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ زندگی کو صِفاتِ خداوندی کی بلندیوں کی طرف لے جانے کے لئے، دو چیزیں ضروری ہیں۔ پہلی چیز کلمہ (نظریہءحیات) جس میں بڑھنے، پھولنے، پھلنے اور خوشگوار نتائج پیدا کرنے کی صلاحیّت ہو، اور دوسری چیز اعمالِ صالح، جو نظریہءحیات کو اوپر اٹھائیں۔'' اَلْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ؕ (35:10) تم غلبہ، تسلّط، قوّت و اقتدار اور عزّت وتکریم چاہتے ہو، تو یہ سب کچھ صِفاتِ خداوندی سے وابستہ ہونے سے حاصل ہو سکتے ہیں"۔ اس آیت میں آگے ہے اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ؕ (35:10)

خدا زمان ومکان سے ماوراء ہے، تو پھر ''خدا کی طرف'' اِلَيْهِ کا مفہوم کیا ہے؟ ''اس کی طرف، یعنی خدا کی طرف۔'' اِلَيْهِ ''طرف'' کے لفظ سے ذہن میں، ضرور ایک مقام آتا ہے۔ خدا زمان اور مکان Time and Space کی حدود سے ماوراء ہے۔ وہ زمان اور ٹائم کے اندر نہیں آسکتا، وہ تو ازلی وابدی ہے، اس لئے وہ Space یعنی کسی جگہ کے اندر بھی نہیں آسکتا۔ یہ جو لفظ اِلَيْهِ ''طرف'' ہے اس سے محسوسات کا خوگر انسان ''کی طرف'' سے کسی مقام کا تصوّر ذہن میں لے آتا

ہے۔ ''اِلَیۡہِ'' کے معنی ہوتے ہیں کہ خدا نے جو مقصد اور منزل انسان کے لئے متعیّن کر رکھی ہے، اس کی طرف جانا۔

یَصۡعَدُ کے معنی ایسی بلندی کے ہوتے ہیں، جیسی کہ پہاڑ کی چڑھائی۔ جہاں صَعدٌ اور صُعُود کے الفاظ آئیں گے، تو ان میں نہایت سست رفتاری، آہستہ آہستہ، محنت و مشقت کے ساتھ بلندی کی طرف چڑھنا مفہوم لیا جائے گا۔ یَرۡفَعُہ کے معنی بھی بلند ہونا ہے، لیکن تیزی کے ساتھ بلند ہونے کا مفہوم اس کے اندر ہوتا ہے۔

قرآن کے نظریاتِ حیات، اقدار خداوندی یا صِفاتِ خداوندی، جو اس نے دیئے ہیں، اُن میں، اس کے امکانات ہیں کہ وہ اپنے زورِ دروں سے بڑھ پھول کر نہایت خوشگوار پھل دیتے چلے جائیں، لیکن اپنے زورِ دروں سے آگے بڑھنے کی، ان کی رفتار بہت سست ہوتی ہے۔ ایک ایک مرحلہ ہزاروں سال میں طے ہوتا ہے، لیکن اگر قوانین خداوندی کو انسان کے اعمال صالح کی رفاقت میسّر آجائے، تو یہ بہت تیزی کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں، اور انسانوں کے حساب و شمار سے دنوں مہینوں یا چند سالوں میں، ہر موسم میں خوشگوار پھل دیتے چلے جاتے ہیں، بشرطیکہ قوانین خداوندی کو انسانی اعمال صالح کی رفاقت بدستور ملتی ہے۔

قوانین خداوندی میں آگے بڑھنے اور بلند ہونے کی صلاحیّت آج بھی موجود ہے، لیکن آج انہیں انسانی اعمال صالح کی رفاقت میسّر نہیں ہے۔ انسانی اعمال کی رفاقت مل جائے، تو اسکیم بہت تیزی کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ یہ وَالۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ ؕ ہے (35:10)۔ اگر انسانی رفاقت میسر نہ آئے تو بھی خدا کی اسکیمیں درجہ بدرجہ، بتدریج اوپر اٹھ رہی ہوتی ہیں یعنی یَعۡرُجُ اِلَیۡہِ (32:5) ہو رہی ہوتی ہیں۔ خدا کی ہر اسکیم نے منزلِ تکمیل تک پہنچنا ہوتا ہے، جلدی اور تیزی کے ساتھ انسانی رفاقت کے ذریعے، اور دیر اور سستی کے ساتھ یعنی کائناتی رفتار سے، انسانی رفاقت کے بغیر۔ مقامِ محمدؐ کے لئے غالبؔ کا ایک نعتیہ شعر دیا جاتا ہے، جس سے انسان اور خدا کی رفاقت کا نظریہ مزید ابھر کا سامنے آتا ہے۔

تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکش حق است اما کشادِ آں ز کمانِ محمدؐ است

یعنی یہ ٹھیک ہے کہ قضا اور تکلیف کے جو تیر ہیں، وہ تو خدا کے ترکش کے اندر ہی ہوتے ہیں۔ تُرکش اُس تھیلے کو کہتے ہیں، جس میں تیر رکھے جاتے ہیں۔ لیکن ان تیروں کو محمد ﷺ کی کمان کے ذریعے ہی چلایا جاتا ہے، ورنہ خدا کے تیر تو خدا کے ترکش کے اندر دھرے کے دھرے ہی رہ جاتے ہیں۔

قرآن نے صفاتِ خداوندی کو قرآن میں اس تفصیل، وضاحت اور حسن و خوبی سے بیان کیا ہے کہ انسان کے لیے، ان کے معیار بننے میں کسی قسم کا شک و شبہ یا ابہام و التباس نہیں رہ سکتا۔ اللہ کی سبھی صفات کا احاطہ کرنا ہمارا موضوع نہیں ہے، لہٰذا، ہم درج ذیل موضوع سے قرآن میں بیان کردہ متعلقہ صفات کا نہایت مختصر تعارف کے بیان پر اکتفا کریں گے، جن کے بشری حد تک انعکاس سے انسانی ذات کی بطور فرد اور اجتماعی طور پر نشوونماء ہوتی ہے۔ قرآن میں دی گئی اِنسانی ذات کی نشوونماء کے مُطلق میعار میں الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی یہاں ہم قرآن میں بیان کردہ انسانی ذات سے بطور فرد اور اجتماعی طور پر سبھی افراد سے متعلقہ اہم الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی کا طوالت سے بچتے ہوئے نہایت مختصر تعارف پیش کرنے پر اکتفا کر رہے ہیں۔

1۔ الخالق

قرآن نے واضح طور پر کہا ہے کہ خالقیت اللہ کی صفت ہے۔

وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ (36:81)

مفہوم: ''وہ خدا ہر قسم کی تخلیق پر قادر اور ہر شے کا علم رکھنے والا ہے۔''

خلق کے معنی ہیں کسی چیز کو ماپنا، اس کا اندازہ کرنا، شے کے مطابق بنانا، کسی شے کا تناسب وتوازن درست کرنا۔ ان معانی کے اعتبار سے خلق کے معنی ہوں گے، مختلف عناصر میں تناسب وتوازن پیدا کر کے، ایک خاص اندازے اور پیمانے کے مطابق کسی چیز کا بنانا۔ تخلیق محض تکرار یعنی ایک جیسی چیز کا بار بار بنائے چلے جانا نہیں، بلکہ نت نئے اضافے کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے کہ:

يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ۭ (35:1)

مفہوم: ''وہ اپنی مشیت کے مطابق خلق میں اضافے کرتا رہتا ہے۔''

انسان کے اندر دو زندگیاں ہیں؛ ایک طبیعی جسم کی زندگی ہے، جو حیوانات کی طرح تولید یعنی نر و مادہ کے اختلاط کا نتیجہ ہے اور دوسری ہے ذات کی زندگی جسے پیدائش سے پہلے کسی نَفَخْ مِن روحہٖ کے عمل کے مرحلہ میں خدا ہر انسانی بچے کو عطا کر دیتا ہے۔ اللہ کی طرف سے ودیعت کردہ انسانی ذات کی پہچان بھی اُس کے تخلیقی اعمال سے ہوتی ہے اور جس فرد یا قوم میں قوتِ تخلیق ہوگی، اُس میں صفاتِ خداوندی کی نمود ہوگی۔ جس قوم میں قوتِ تخلیق نہیں اس میں صفاتِ خداوندی کی نمود نہیں۔ انسانی ذات نر و مادہ کے اختلاط کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ خالص قوتِ الٰہی کا پیدا کردہ عطیہ ہے۔ اس لئے انسانی جسم تو تولید کا رہین منّت ہے، لیکن ذات نر و مادہ کے اختلاط کا نتیجہ ہے۔ طبیعی جسم اپنے جیسا طبیعی جسم تو پیدا کر سکتا ہے، لیکن کوئی انسانی ذات اپنی جیسی ذات پیدا نہیں کر سکتی. ذات تولید نہیں بلکہ صرف تخلیق کرتی ہے، چاہے وہ اللہ کی ذات ہو اور چاہے اِنسانی ذات۔

اِسی بِنا پر اللہ نے اپنے آپ کو احسن الخالقین یعنی سب خالقوں میں سے سب سے احسن خالق کہا ہے۔ اس سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ نے اپنے سوا بھی خالق تسلیم کرتا ہے۔ نباتات وحیوانات میں تخلیق نہیں ہے تو یہ ادنیٰ درجے کا تخلیق کار انسان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ علامہ اقبال کا قول ہے کہ جس شخص میں قوّتِ تخلیق نہیں، وہ کافر و زندیق ہے۔

اللہ کی طرف سے ودیعت کردہ انسانی ذات کی پہچان بھی اُس کے تخلیقی اعمال سے ہوتی ہے اور جس فرد یا قوم میں قوتِ تخلیق ہوگی، وہی حدِ بشریت صفاتِ خداوندی کی نمود کرنے کی اہل ہوگی اور جس قوم میں قوتِ تخلیق نہیں اس میں صفاتِ خداوندی کی نمود کی گنجائش بھی نہیں۔ بعض نے لفظ خلق کے معنی تخلیقی عادات واطوار کے لئے ہیں۔

قرآن کریم نے نبی اکرم ﷺ کے متعلق اُن کے تخلیقی اعمالِ حسنہ کی بِنا پر ہی کہا کہ:

وَاِنَّكَ لَعَلٰي خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ (68:4)

مفہوم: ''اور یقیناً تو خلق عظیم کا مالک ہے۔''

قرآن نے یہاں شہادت دی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کو نوع انسانی کے لئے عظیم ترین تخلیق کا نمونہ ہیں، جنہوں نے حدِ بشریت اللہ کے الاسماء الحسنیٰ کا اپنی ذات میں انعکاس کیا ہوا تھا۔ اس لئے رسول کی سُنت کی پیروی میں اللہ کی اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی بشری حد تک انعکاس کرتے ہوئے اس کے بندوں کی بھی یہ شان ہونی چاہیے کہ وہ اپنے تخلیقی کارناموں میں نئے نئے اور عظیم اضافے کرتے رہیں۔

2۔ الرّب:

کسی شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے بتدریج مقامِ تکمیل تک پہنچانا، اس مقصد کے لئے شے کی پوری پوری نگہداشت کرنا، اور اس کے حسبِ حال اسباب مہیا کرنا، جو اس کی ضروریات کے کفیل ہوں، اور جس پر اس کی زندگی کا انحصار ہو، ربوبیت کہلاتا ہے۔ راغب کے الفاظ میں اِس کے اصل معنیٰ تربیت کرنا یعنی کسی چیز کو تدریجاً نشوونما دے (آہستہ آہستہ بڑے کرکے) کر حد کمال (مکمل کر دینا) تک پہنچانا کے ہیں۔ اللہ کی یہ ربوبیت کسی خاص نوعِ مخلوق، کسی خاص گروہ، کسی خاص قوم کے لئے نہیں بلکہ وہ ربُ العالمین ہے یعنی ساری دنیا کی ربوبیت کا ذمہ دار ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (1:1)

مفہوم: ''ہر قسم کی حمد اللہ ہی کی شان ہے، جو تمام جہانوں کا رب ہے۔''

رب کا مادہ ''ر۔ب۔ب'' ہے۔ اس کے بنیادی معنی نشوونما دینا یعنی کسی چیز کو نئی نئی تبدیلیوں سے اس طرح گزارنا کہ وہ بتدریج نشوونما پاتی ہوئی، اپنے اُس نقطۂ تکمیل تک پہنچ جائے، جو اس کے لیے خدا نے عالمِ امر میں متعین کیا تھا۔ یہ طریق نشوونما ربوبیت کہلاتا ہے، اور اس طرح نشوونما دینے والے کو رب کہا جاتا ہے۔ ان معانی کے اعتبار سے رب العالمین کے معنی ہوں گے ''تمام نوع انسانی کی نشوونما کا ذمہ دار''۔ ہم اس کے لیے عام طور پر عالمگیر ربوبیت کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ خدا کے عالمگیر انسانیت کی ربوبیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن کا خدا، کسی خاص قبیلہ، نسل، قوم یا کسی خاص مذہب کا رب نہیں ہے۔ وہ تو عالمگیر انسانیت کا رب ہے۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ قرآنی خدا پر ایمان رکھنے والی جماعت جب نظام متشکل کرے گی، تو وہ خدا کی صفت رب العالمینی کو محسوس طور پر سامنے لائے گی یعنی وہ پوری نوع انسانی کو سامان نشوونما بہم پہنچانے کی ذمہ داری اپنے سر لے گی۔

3۔ الرزاق:

وہ سامانِ زیست جو کسی کی طرف سے بطور عطیہ ملے، رزق کہلاتا ہے۔ لیکن اس کے بنیادی معنوں میں ایک خصوصیت ہے، اور وہ یہ کہ وہ شے ضرورت کے مطابق، عین وقت پر ملے۔ لہٰذا رزق سے مراد وہ سامانِ نشوونما ہے، جو خدا کی طرف سے ہر شے کی ضرورت کے مطابق بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے۔ قرآن نے تمام کھانے پینے کی چیزوں کو رِّزْقِ اللّٰهِ کہا ہے۔ جیسے

كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ (2:60)

مفہوم: ''اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے کھاؤ اور پیئو۔''

قرآن کی رو سے اللہ کی طرف سے نہ صرف رزق بلکہ رزقِ کریم ملتا ہے۔ اِس لئے اس کا قدرے تفصیل سے جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔قرآن میں ہے کہ:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ (22:50)

مفہوم: ''اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں، اور اعمال صالحہ کرتے ہیں، ان کے لئے خطرات سے حفاظت اور باعزت رزق ہے۔''

رِزْقٌ كَرِيْمٌ: رزق سے مراد صرف روٹی ہی نہیں ہے، بلکہ ہر وہ شے، جس پر انسانی زیست کا دارومدار ہے، عربی زبان میں اسے رزق کہا جاتا ہے۔لفظ رزق میں نشوونما بھی آجاتی ہے۔رزق کے اندر زندگی کو برقرار رکھ کر اس کی نشوونما کرتے چلے جانے والے اسباب وذرائع بھی آجاتے ہیں۔ان سب کو قرآن کریم رزق سے تعبیر کرتا ہے۔رزق کے ساتھ "کریم" کا بھی اضافہ ہے یعنی رزق عزّت کے ساتھ ملے گا۔سوال یہ ہے کہ رزقِ کریم (عزت کی روٹی) کسے کہتے ہیں اور وہ کیسے ملتی ہے؟ بات صاف ہے کہ، ایک معاشرہ ایسا ہوتا ہے، جس میں رزق کے سرچشمے چند انسانوں کے قبضہ واختیار میں ہوتے ہیں، اور باقی افراد روٹی کے لئے، ان کے محتاج اور دست نگر ہوتے ہیں۔ بالا دست طبقہ ان دست نگر افراد سے اپنی مرضی کے مطابق کام لیتا ہے۔اس طرح ان کی احتیاج انہیں محکومی پر مجبور کر دیتی ہے۔ظاہر ہے کہ اس طرح روٹی ملنے میں، عزتِ نفس اور شرفِ انسانیت باقی نہیں رہ سکتا۔ یہ ذلت اور محکومی کی روٹی ہے۔

اس کے برعکس دوسرا معاشرہ ہے، جس میں وسائلِ رزق کسی فرد کی ملکیت میں نہیں بلکہ وہ تمام ضرورت مندوں کی ضروریات کو پورا کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں اور اربابِ نظم ونسق ان کا انتظام اس طرح کرتے ہیں کہ کوئی فرد اپنی ضروریات سے محروم نہ رہنے پائے۔اس میں نہ کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج ہوتا ہے، اور نہ محکوم۔اس معاشرہ میں ہر فرد کو عزت کی روٹی ملتی ہے۔رزاقیت خدا کی صفت ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6)

مفہوم: ''اور کوئی نہیں چلنے والا زمین میں، مگر اللہ پر ہے اس کا رزق۔''

خارجی دنیا میں اس صفت کا ظہور طبیعی قوانین کی رو سے، ازخود ہوتا رہتا ہے، لیکن انسانوں کی دنیا میں اس کا قاعدہ بدل جاتا ہے۔اس میں رزق کے سرچشمے تو خدا کی طرف سے بلا معاوضہ ملتے ہیں، لیکن ایک تو حصولِ رزق کے لئے تجسس وکاوش کرنی پڑتی ہے اور دوسرے رزق کی تقسیم قوانینِ خداوندی کے مطابق کرنی ہوتی ہے۔ایسا کچھ وہی جماعت کر سکتی ہے، جس کے افراد اپنی ذات میں خدا کی صفتِ رزاقیت کی نمود کر لیں۔اب ظاہر ہے کہ جب نظامِ معیشت اس قسم کے جماعت کے

ہاتھ میں ہوگا، تو نوعِ انسانی رزق کی طرف سے کس قدر مطمئن ہوگی۔

4۔ الرحیم :

رحمت کے معنی ہوتے ہیں وہ عطیہ، جو کسی ظاہری اور باطنی کمی کو پورا کر دے، اس کی یوں پرورش ہو جائے کہ جس طرح رحمِ مادر میں جنین کی پرورش ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے رحمتِ خداوندی بھی اس کی صفتِ ربوبیت اور رزاقیت ہی کی ایک کڑی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ اس میں نرمی کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ نیز اس کے معنی حفاظت کے لئے ڈھانپ لینے اور سامانِ حفاظت بہم پہنچانے کے بھی ہوتے ہیں۔ جب باہمی تعلقات میں رحمت یا رحم کا لفظ آئے گا، تو اس کا مفہوم محبت رافت اور مؤدت بھی ہوگا۔ اس مادہ سے یعنی خدا کی صفتِ رحمت کے لئے رحیم اور رحمن کے الفاظ بکثرت آتے ہیں۔

الرحمہ کا مادہ رحم ہے۔ اس سے مراد عورت کے بطن کا وہ خانہ ہے، جس میں بچہ پرورش پاتا ہے، اور اس غلاف میں خارجی اثرات سے بچہ محفوظ رہتا۔ اِن معانی میں رحمہ وہ عطیہ ہوگا کہ جسے بقدرِ ضرورت اور بلا معاوضہ دیا جائے، اور جو کسی کی ظاہر و باطن کی کمی کو پورا کر دینے کے لئے کافی ہو۔ قرآن میں ہے کہ:

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ (6:54)

مفہوم: ''تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر فرض ٹھہرا لیا ہے۔''

قانونِ مکافات میں لغزش کی سزا فوری طور پر نہیں دی جاتی بلکہ انسان کی اصلاح کے لئے توبہ اور عملِ صالح کی گنجائش رکھ دی جاتی ہے، جسے خدا کا رحم کہا جاتا ہے۔ مومنین بھی یہی گنجائش اپنے معاشرے کے قوانین میں شامل کرتے ہیں تاکہ لغزش سے ہونے والے نقصان ہونے کا ازالہ کر سکیں۔ الرحمۃ کے رحم کے مادہ سے فعیل کے وزن پر رحیم کے معنی ہوں گے، سامان نشوونما مسلسل اور بغیر منقطع کے بہم پہنچانے والا۔ اس مادہ سے فعلان کے وزن پر رحمان کے معنی ہیں، وہ جو کسی ضرورت کے وقت شدت اور غلبہ کے ساتھ سامان رحمت کو ہنگامی طور پر بہم پہنچانے والا ہو۔ رحیم، نشوونما کا عام ارتقائی طریق ہے اور رحمان، فجائی ارتقاء یا انقلابی ارتقاء کا طریق کہلاتا ہے۔ چونکہ رحم میں نرمی ہوتی ہے، اس لئے اسی مادہ کا یہ لفظ رحماء قرآن میں سختی کے مقابلہ میں نرمی کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (46:29)

مفہوم: ''محمد رسول اللہ، اور انکے رفقائے کار (مومنین) کی کیفیت یہ ہے کہ کفار کے مقابلہ میں سخت، لیکن باہم دیگر بڑے نرم ہیں۔'' رحم بمعنی بخشش کے تصور میں عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسانی بچہ، اپنے پہلے ماں باپ کے گناہ کی پاداش میں گناہ گار پیدا ہوتا ہے، اور یہ گناہ عمل سے زائل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ان کے نزدیک نجات صرف اللہ کے رحم یعنی بخشش سے ہی ممکن ہے۔ رحم کا یہ تصور غیر قرآنی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے انسان اپنی منزل و مقصود تک، اللہ کے رحم یعنی بخشش سے نہیں، بلکہ قوانین خداوندی کے مطابق اپنے اعمال کے نتائج کی رو سے پہنچتا ہے۔ عیسائیت اور اسلام کا یہی بنیادی فرق ہے

جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا کہ:

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ تا جزائے عملِ تُست، چناں چیزے ہست

اگر جنت بھی تجھے عیسائیوں کے تصورِ رحم بمعنی بخشش میں ملے، تو اسے قبول مت کر۔ اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ جنت کا حصول تمہارے اعمالِ صالح کا نتیجہ ہے۔

5۔ النعیم:

النعیم، نعم سے ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز یا منظر کا ایسی کیفیت لیے ہوئے ہونا، جس سے آنکھوں کو ٹھنڈک حاصل ہو۔ مزید یہ کہ انسان کی معاشرتی زندگی کے ہر پہلو کا خوشگوار، کشادہ، آسودہ، شاداب اور بلند ہونا نعمت ہے۔ خدا کی صفت یہ ہے کہ وہ انسان کو انعمتَ یعنی نعمتیں دینے والا ہے، اور ان کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے۔

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53)

مفہوم: ''جو کچھ تمہیں بطورِ نعمت ملا ہے، وہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔''

اکثر دیکھا گیا ہے کہ اقوامِ مغرب کو وہ تمام خوشگواریاں اور توانائیاں حاصل ہیں، جو النعیم کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اس اعتبار سے تو وہ اقوام منعم علیہ قرار پائیں گی، حالانکہ وہ خدا کی منکر اور اس کی متعین کردہ انسانی اقدار کو تسلیم نہیں کرتیں۔ اس کا ایک جواب ہے، جس کا مشاہدہ عصرِ حاضر میں یوں ہو رہا ہے کہ خدا کے قوانین کی دو شقیں ہیں۔ ایک قوانین وہ ہیں، جن کا تعلق مادی کائنات سے ہے۔ انھیں قوانینِ فطرت کہا جاتا ہے۔ جو قوم ان قوانین کے مطابق فطرت کو مسخر کر لے گی، اسے خوشحالی اور توانائیاں مل جائیں گی۔ اس میں مومن اور کافر کی کوئی تمیز نہیں۔

قوانینِ خداوندی کی دوسری شق کا تعلق انسانی زندگی سے ہے۔ جو قوم فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے، لیکن انہیں قرآنی قوانین کے مطابق صَرف میں نہ لائے، تو اسے نہ خود داخلی سکون نصیب ہوگا، اور نہ ہی باقی نوعِ انسانی کو، اس کی طرف سے اطمینان وسون ملے گا، جس کی النعیم کی دولت کی حامل اقوام ہوتی ہیں۔ لہٰذا، جو قوم فطرت کی قوتوں کے ماحصل کو خدائی اقدار کے مطابق صرف کرے گی۔ اس کی اپنی ذات کی بھی نشوونما ہوتی چلی جائے گی، اور باقی دنیا بھی ان کے زیرِ عاطفت امن اور چین کی زندگی بسر کرے گی۔ اِس طرح انعامِ خداوندی کا مُستحق ہوا جاتا ہے اس کے ساتھ یہ بھی وضاحت کر دی کہ یہ نعماءِ خداوندی مشروط ہے دینِ خداوندی کے ساتھ متمسک رہنے ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (8:53)

مفہوم: ''یاد رکھو! خدا کا یہ محکم قانون ہے کہ زندگی کی جو نعمتیں (خوشگواریاں) وہ (اللہ) جو کسی قوم کو عطا کرتا ہے، ان میں اس وقت تک تبدیلی نہیں کرتا، جب تک وہ قوم خود اپنے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی نہیں پیدا کر لیتی، جس سے وہ ان

خوشگواریوں کی اہل نہ رہے۔ بے شک اللہ سمیع وعلیم ہے۔''

6۔ ذوالفضل:

فضل: نقص کی ضد ہے۔ کسی چیز کا متوسط ضرورت سے زائد ہونا، مرتبہ کی بلندی اور برتری، بھلائی کی کثرت اور زیادتی کا ہونا۔ قرآن کریم میں ہے کہ۔

وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (2:105)

مفہوم: ''ہر قسم کے فضل عظیم کا مالک اللہ ہے۔''

اللہ بلا امتیاز یہ فضل ہم سب کو اپنے قانونِ مشیت کے مطابق عطا کرتا ہے، اِس اِنتباہ کے ساتھ کہ وہ سبھی کی منفعت کے لئے استعمال کیا جائے تو نعمت ہوگا اور اپنی ذات ہی پر مخصوص ہونے سے نعمتِ خداوندی سے تجاوز کرنے کا موجب ہوگا۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿71﴾ (16:71)

مفہوم: ''جہاں تک رزق کمانے کی صلاحیت اور استعداد کا تعلق ہے، وہ مختلف انسانوں میں مختلف ہے، لیکن جن لوگوں کو زیادہ استعداد دی گئی ہے، وہ زائد رزق کو اپنے ماتحتوں کی طرف نہیں لوٹاتے، اس خیال سے کہ اس طرح رزق سے فائدہ اٹھانے کے معاملہ میں سب مساوی ہو جائیں گے، تو کیا یہ اللہ کے فضل کا انکار کرتے ہیں۔''

یعنی کیا یہ لوگ اللہ کی دی ہوئی نعمت کی حدود فراموشی کرتے ہیں؟ زیادہ رزق کمانے کی استعداد، اللہ کی طرف سے بطور فضل یعنی بلا معاوضہ ملتی ہے، لہذا اِس استعداد کے ماحاصل کو اپنی ذات کے لئے مخصوص قرار دینے کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ قرآن میں ایک دوسرے مقام پہ اللہ کی نعمتوں سے فیضیاب ہونے والی اقوام کے متعلق کہا گیا ہے کہ:

وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (2:47)

مفہوم: ''میں نے تمہیں تمہاری ہم عصر اقوام پر فضیلت اور برتری عطا کی۔''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو معاشرہ ان افراد پر مشتمل ہوگا، جن کی ذات کی نشوونما ہوگئی ہو، اس معاشرہ کو یہ تمام افضال واکرام قوانینِ خداوندی کی رو سے حاصل ہوں گے، اور وہ انہیں تمام نوعِ انسان کی ربوبیت کے لئے عام کر دے گا۔ اس کو فضل کہتے ہیں۔ لہٰذا یہ دیکھنے کے لئے کہ کوئی معاشرہ قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل ہے یا نہیں، دیکھنا یہ ہوگا کہ اس معاشرہ کو زندگی کی خوشگواریاں باافراط میسر ہیں یا نہیں؟ اور پھر یہ کہ وہ ان خوشگواریوں کو نوعِ انسانی کے لئے عام کیے ہوئے ہیں یا نہیں؟

7۔ المنّ (منن):

فضل، رحمت اور انعام کے سلسلہ میں قرآن کریم نے ایک اور خصوصیت کا بھی ذکر کیا ہے کہ جسے اس نے منن کے لفظ

سے تعبیر کیا ہے۔ منن سے مراد ہے کسی کو بلا مزد و معاوضہ اور بغیر محنت اور مشقت کے کچھ دینا ہے۔ جیسے سامانِ زیست (ہوا، روشنی، حرارت، پانی، زمین اور اس کا رزق) تمام نوعِ انسان کو بلا مزد و معاوضہ دے رکھا ہے۔ یہ خدا کی صفت منّ ہے، جس کی نمود اس کے بندوں میں بھی ہونی چاہیے۔ اسے ہمارے ہاں احسان بھی کہا جاتا ہے۔

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ (28:5)

مفہوم: ''ہم چاہتے ہیں کہ احسان کریں، ان لوگوں پر جو زمین میں کمزور کر کے رکھے گئے ہیں۔''

ان مقامات سے واضح ہوا کہ خدا کی ذات، نوع انسانی کو سامانِ زیست اور ہدایت بلا معاوضہ دیتی ہے، اور کسی پر احسان نہیں رکھتی۔ نشوونما یافتہ ذات کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ ضرورت مند کو بلا معاوضہ دیتی ہے، اور اس کے بدلے کا خیال تک بھی اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتا۔ وہ جس ضرورت مند کی ضرورت پوری کرتے ہیں، ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیتے ہیں۔

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ (76:9)

مفہوم: ''بے شک ہم تمہیں خدا کی خوشنودی کے حصول کے لئے کھلاتے ہیں ہم تم سے کوئی معاوضہ تو ایک طرف، شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں۔''

قرآن کریم میں ہے کہ:

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝ (74:6)

مفہوم: ''اس نیت سے احسان نہ کرو کہ اس کے بدلے میں تجھے اس سے زیادہ ملے۔''

دوسرے مقام پہ ہے کہ:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى (2:262)

مفہوم: ''جو اللہ کی راہ میں اس طرح صرف کرتے ہیں کہ نہ معاوضہ کا خیال کرتے ہیں اور نہ ہی احسان جتا کر وجہ اذیت بنتے ہیں۔''

اسلامی مملکت کو چلانے کے لئے، ایسے انسان تیار کیے جاتے ہیں، جو دوسروں کی ضرورت کو، اپنی ضرورت پر ترجیح دیں۔ جو خود تنگی ترشی میں گزارا کر کے، دوسروں کو آسائش پہنچائیں۔

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (59:9)

مفہوم: ''یہ ہمیشہ ان آنے والوں کی ضروریات کو، اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں، خواہ انہیں خود تنگی ہی سے گزارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔''

دنیا کا کوئی قانون یہ نہیں کر سکتا۔ یہ قانون سازی نہیں ہے بلکہ انسان سازی ہے، نفسیاتی تبدیلی ہے۔ اسلامی نظام میں یہ بات نہیں کہ دینے والوں کو کچھ نہیں مل رہا ہوتا، دینے کے عمل سے، دینے والوں کی اپنی ذات کی نشوونما ہو رہی ہوتی ہے۔

قرآن مومنین کو کہتا ہے کہ وہ اسلامی قوانین پر خود بھی چلیں، اور دوسروں سے بھی اسلامی قوانین کی اطاعت کا مطالبہ کریں۔ گویا حکومت سازی سے پہلے، انسان سازی کرنا پڑتی ہے۔ یہ قانون سازی کی بات نہیں ہے، یہ تو انسان کے اندر ایک نفسیاتی تبدیلی ہے، شخصیّت کی تبدیلی ہے، یہ تو سیرت کی تبدیلی ہے، یہ تو قلب ونگاہ کی تبدیلی ہے، جو قرآن کی تعلیم سے ہو جاتی ہے۔ انسانوں میں یہ تبدیلی آ جائے، تو پھر اسلامی قوانین اپنے نتائج برآمد کریں گے، ورنہ محض قانون سے تو کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکے گا۔ صرف قانون کے زور پر آپ یہ نہیں کر سکتے کہ لوگ اپنی ضرورت پر، دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دیں، اور خود تنگی ترشی میں گزارا کریں۔

8۔ الغضب:

ہمارے ہاں عام طور پر اور راغب نے بھی غضب کے معنی غصہ اور انتقامِ الٰہی کے لئے ہیں۔ لیکن جب یہ لفظ خدا کی طرف منسوب ہوگا، تو اس کے معنی غصہ کے نہیں ہوں گے۔ غصہ تو انسانی جذبات کا مظہر ہے، لیکن اللہ، انسانی جذبات اور ان کی پیدا کردہ کیفیات سے بہت بلند ہے، اس لئے اللہ کے غضب سے مراد، اس کے قانون کی خلاف ورزی کے ناخوشگوار فطری نتائج ہیں۔ جس طرح اللہ کی خوشنودی کا مطلب اس کے قوانین کے مطابق چلنے کے خوشگوار نتائج لئے جاتے ہیں۔

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ﴿٨١﴾ (20:81)

مفہوم: ''جو خوشگوار چیزیں تمہیں دی جا رہی ہیں، انہیں کھاؤ، پیو، لیکن اس باب میں حدود شکنی مت کرو۔ اگر ایسا کرو گے، تو تم پر میرا ہلاکت انگیز غضب آئے گا۔ جس پر میرا غضب ہو وہ پستی میں گر جاتا ہے۔''

یہاں غضب کا نتیجہ بتایا ہے کہ فَقَدْ هَوٰى: ''وہ ذلّت کی گہرائیوں میں گر جایا کرتی ہے''۔ حرص وہوٰی کے الفاظ تو آپ نے اپنے ہاں بھی سنے ہوں گے۔ عربی میں ''ہوٰی'' اس چیز کو کہتے ہیں، ''جیسے پہاڑ کی چوٹی سے کسی پتھر کو گرانے کے لئے چھوڑا جائے، تو شروع میں تو پتھر کے گرنے کی رفتار آہستہ ہوتی ہے، پھر وہ پتھر بڑی تیزی سے نیچے کی طرف آ رہا ہوتا ہے۔ تیزی سے پستیوں کی طرف آنے کو عرب ہوٰی کہتے ہیں۔ اور اس لفظ کو ان پست جذبات کے لئے استعمال کرتے تھے جو انسان کو شرافت کے بلند معیار سے، پستیوں میں گرا دے۔ کہا کہ رزق کو طے شدہ قانون وضابطے کے مطابق ہی کھانا۔ اگر قانون وضابطے کو چھوڑ کو اپنی حرص وھوٰی کے پیچھے لگ گئے تو تم غضب کے نتیجہ میں شرف انسانیّت کی چوٹیوں سے پستیوں کی طرف چلے جاؤ گے۔ یہ ہے فَقَدْ هَوٰى یعنی ذلّت کی پستیوں میں گر جانا۔

قرآن کریم میں ہے کہ:

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ (2:61)

مفہوم: ''اللہ کے غضب کا نتیجہ ذلت اور محتاجی ہے۔''

9۔ اللّعنہ :

قرآن میں انعام کے مقابلے میں غضب اور رحمت کے مقابلے میں لعنت کا ذکر آتا ہے۔ لعنت کے معنی دور کرنا یا محروم کرنا ہے۔ جس فرد کی ذات کی نشوونما ہوجاتی ہے، اور جو قوم قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے، وہ زندگی کی خوشگواریوں (انعاماتِ خداوندی) سے بہرہ ور ہوجاتی ہے،

قرآن میں ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ ہم قرآنی تعلیم سے کبھی اثر پذیر نہیں ہوسکتے کیونکہ

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (2:88)

مفہوم: ''وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل غلافوں کے اندر ہیں، ایسا نہیں بلکہ وہ اپنے انکار و سرکشی کی وجہ سے سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیتوں سے اللہ کے قانون مکافات کے مطابق محروم کر دیے گئے۔''

لہٰذا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں خدا کافروں پر لعنتیں برساتا ہے، تو انہوں نے لعنت کے قرآنی مفہوم کو نہیں سمجھا۔ خدا (معاذ اللہ) گالیاں نہیں دیا کرتا۔ اس نے یہاں اپنے قانون مکافاتِ عمل کی وضاحت کی ہے کہ جو شخص غلط راہوں پر چل نکلتا ہے، وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اس کے غلط اعمال کے اس نتیجہ کو غضب کی طرح یہاں لعنت کہا گیا ہے۔

فرد کی طرح جو قوم قوانین کے خلاف زندگی بسر کرتی ہے، وہ ان خوشگواریوں سے محروم اور دور رہ جاتی ہے، اسے خدا کی لعنت کہتے ہیں۔ یعنی اس کے فضل و اکرام سے محرومی۔ اس کی نعمت و رحمت سے دوری۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۝ (2:159)

مفہوم: ''جو لوگ اس کو چھپاتے ہیں، جو ہم نے کھلی باتوں اور ہدایت سے اتارا ہے، وہ بھی اس کے بعد کہ نے اسے کھول کر کتاب میں بیان کر دیا ہے۔ یہی ہیں وہ لوگ کہ اللہ جن پر لعنت کرتا ہے۔ اور لعنت کرنے والے بھی اُن پر لعنت کرتے ہیں۔''

ابھی بھی قرآن کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ جس قوم کے افراد کی ذات کی نشوونما ہوچکی ہو، اس میں صفاتِ خداوندی کی نمود ہونے کی وجہ سے:

1۔ اس قوم کی زندگی ان جیسی کبھی نہیں ہوگی، جن پر خدا کا غضب اور لعنت وارد ہوچکی ہو اور

2۔ وہ قوم اتنی قوتوں کی مالک ہوگی کہ غلط روش پر چلنے والی قوموں کے اعمال کے تباہ کن نتائج مشہود طور پر ان کے سامنے لا سکے یعنی انہیں جرائم کی سزا دے سکے، اور اس طرح دنیا میں نظامِ عدل و انصاف عملاً قائم کر کے دکھا دے۔

10۔ القہار:

قہر سے مفہوم غصہ اور عتاب نہیں بلکہ غلبہ وتسلّط اور قوت وشدت ہے۔ یہ صِفت اپنے مفہوم سے واضح کرتی ہے کہ ایک نشوونما یافتہ ذات میں، جہاں ایک طرف رافت ومحبت کی صفات ہوتی ہیں، تو دوسری طرف قوت اور جبروت کی صفات بھی ہوتی ہیں۔ ان سے فساد انگیز قوتوں کو سرکشی سے روکا جاتا ہے۔

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ (6:18)

مفہوم: ''اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔''

یہ قہاریت اللہ کے شایانِ شان ہے کیونکہ ساری کائنات پر اسی کا غلبہ واقتدار ہے، لیکن جب کوئی انسان قہاریت کا دعویٰ کرے، تو اس کا نام فرعونیت ہوتا ہے۔ مگر ظلم کی قوتوں پر غلبہ حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔ ان معنوں میں یہ صفت مومنین کے لئے محمود صفت ہوگی۔ یہ ذہن میں رہے کہ قوت اپنی ذات میں نہ خیر ہے اور نہ شر۔ اس کا استعمال اس کے خیر یا شر ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اگر قوت کو کسی کمزور پر ظلم کرنے کے لئے استعمال کیا جائے، تو وہ شر ہے اور اگر اسے ظالم کا ظلم روکنے کے لئے استعمال کیا جائے تو عین خیر ہے۔

علامہ اقبال نے اِس صِفت کی اہمیت کا اظہار اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے کہ:

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

11۔ الجبار:

جبر کے معنی ہیں کسی بگڑی ہوئی بات کی اس انداز سے اصلاح کرنا، جس میں قوت سے کام لیا جائے۔ مثلاً جب ہڈی ٹوٹ جائے، تو اسے چند لکڑیوں میں جکڑ کر بطریقِ احسن باندھ دیا جاتا ہے، جس سے وہ جڑ جاتی ہے۔ اس اندازِ اصلاح کو جبر کہتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکڑیاں، جن سے ہڈی کو اس طرح جکڑا جاتا ہے الجبائر کہلاتی ہیں، اور جو شخص لکڑیوں کو اس طرح باندھتا ہے اس کو جبار کہتے ہیں۔ لہٰذا الجبار کے معنی ہیں، وہ ذات جس نے تمام نظامِ کائنات کو اپنے قوانین کی قوت (ملائکہ) سے اس انداز سے جکڑ رکھا ہے کہ کوئی شے اپنے مقامِ متعین سے ایک انچ بھی ادھر ادھر نہیں ہٹ سکتی اور اسے جکڑنے میں ظلم وجور کا شائبہ نہیں بلکہ یہ سرتاسر حکمت ومصلحت پر مبنی ہے۔

اَلْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (59:23)

مفہوم: ''اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا اور بڑا ہو کر رہنے والا۔ پاک ہے اللہ اس شرکت سے جو لوگ کر رہے ہیں۔''

ظاہر ہے کہ جبر میں، دونوں قوت اور شدت کا پہلو مضمر ہے۔ لیکن عام انسان اس قوت کو فساد کے لئے استعمال کریں گے، اس لئے ان کی طرف سے جبر اور قہر مذموم ہوگا۔ لیکن یہی قوت (جبر اور قہر) خدا کی طرف سے یا اس نظام کی طرف سے جو قوانینِ خداوندی کے نفاذ کا ذمہ دار ہو استعمال ہوگی، تو اس سے مقصد اصلاح ہوگا۔ مختصر یوں سمجھئے کہ اس جگہ قہر، اور جبر سے مفہوم ہوگا سرکش قوتوں کو قوانین کی گرفت میں رکھنا۔ اور یہی مومنین کے معاشرہ کا اہم فریضہ ہوتا ہے۔ (جاری ہے)

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(قسط نمبر 4)

قرآن پر اعتراضات کے جوابات

(7) معترض کا اعتراض ہے کہ قرآن کے دوبارہ مطالعہ کرنے بعد بھی انہیں Disappoinment ہوئی کہ قرآن میں ایسی کوئی بات نہیں جو نادر ہو اور قابل توجہ ہو۔ ہم نے ان کے جواب میں وہ مواد پیش کیا ہے جو صرف قرآن نے اس وقت پیش کیا جب تک عقل انسانی اس تک نہیں پہنچی تھی۔ اس سلسلہ میں مواد تو بہت ہے اصل یہ ہے کہ قرآن تو ایک سمندر ہے یہ شناور کی اپنی قابلیت اور اہلیت پر ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کے ہیرے موتی نکالتا ہے۔ ہم اسی سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ قرآن نے ایک ایسی چونکا دینے والی آیت پیش کی ہے کہ اگر کوئی شخص صرف اسی ایک آیت پر غور کرے تو وہ قرآن کے وحی الٰہی ہونے کا انکار نہیں کر سکتا۔ سورہ رعد میں ارشاد عالی ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ ؕ (13:11) ترجمہ: اور اللہ نہیں بدلتا کسی قوم کی حالت جب تک وہ نہ بدلیں جو ان کے جیسوں میں ہے ترجمہ حضرت شیخ الہند۔ اردو زبان میں اس مضمون کا ایک شعر ہے جو غلطی سے مولوی ظفر علی خان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کیونکہ اصل میں شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی کا شعر ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

کسی قوم کی نفسیات کو تبدیل کئے بغیر صرف یہ نہیں کہ اس کی حالت نہیں بدلتی بلکہ اس کا کچھ بھی نہیں بدلتا کسی قوم کی خارجی حالت کے اندر تبدیلی نہیں آسکتی تاوقت کہ ان افراد کے اندر نفسیات میں تبدیلی پیدا نہ ہو پائے۔ اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا تاوقت وہ قوم خود کو نہ بدل لے۔ آپ اگر غور سے دیکھیں تو خدا اس قوم کو Follow کر رہا ہوتا ہے کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس کے مطابق میری طرف سے ردعمل آتا رہے گا اگر تم اس طرح تبدیلی کرو گے تو میں اس کا اس طرح ردعمل دوں گا ابتداء Initiative قوم کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے: یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰہَ یَنۡصُرۡکُمۡ (47:7) ترجمہ: اے ایمان والو اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اس مقام پر بھی Initiative مومنین کے ہاتھ میں ہے مومنین کو اختیار ہے کہ وہ اللہ کی مدد کریں یا نہ کریں لیکن اللہ اس صورت حال میں مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق ضرور مومنین کی مدد کرے گا اور قرآن نے مدد کی بھی وضاحت کر دی۔ وَیُثَبِّتۡ

اَقْدَامَكُمْ (47:7) اللہ تمہارے قدموں کو جما دے گا۔ یہ وہی نفس کی تبدیلی ہے۔ حیرانی اس بات پر ہے کہ نزول قرآن کے دور میں نفس کا کہیں تصور نہیں تھا ہر جگہ روح کا تصور تھا قرآن نے نفس کا تصور دیا لیکن یہ تصور اس درجہ انقلاب انگیز تھا کہ مسلمانوں نے اگرچہ اس تصور کو اختیار کر لیا اور روح انسانی کی تردید کر دی لیکن پھر کچھ عرصہ بعد نفس کے تصور کو ترک کر دیا اور پھر وہی روحانیات کا تصور اپنا لیا جو قرآن کے خلاف ہے اور یہی روحانیت کا تصور مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا سبب اصلی ہے۔

تغیرات کا Origin اور سرچشمہ نفس انسانی ہے۔ رسول اللہؐ کے متعلق فرمایا: رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ط (2:129، 3:164، 62:2) رسول اللہ کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے تھے اور انہوں نے ایک ایسا نظام قائم فرمایا کہ اس نظام میں تمام لوگوں کی نفسوں کی نشوونما ہو جاتی تھی۔ عیسائیت کا عقیدہ ہے کہ ہر بچہ گنہگار پیدا ہوتا ہے حضرت عیسیٰؑ کو صلیب دینے کے گناہ کی وجہ سے ہر بچہ کی روح گناہ میں آلودہ ہوتی ہے اس لیے عیسائیت میں روح کو پاک کرنے کی جدوجہد کی جاتی ہے یہ عیسائیت کا ہی اثر ہے کہ ہمارے ہاں بھی تزکیہ نفس سے مراد روح انسانی کو پاک کرنا ہو گیا۔ قرآن کریم کے نزدیک نفس انسانی میں پیدائش کے وقت اس کے اندر کوئی کثافت نہیں ہوتی اس کے اندر کچھ بننے کی صلاحیتیں ہوتی ہیں ان صلاحیتوں کو کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے اس کی تفصیل ہم اقامت دین کے موضوع کے ذیل میں عرض کریں گے۔

نفس انسانی اور ذات انسانی ایک ہی چیز ہوتے ہیں۔ نفس کیا چیز ہے یہ بتایا نہیں جا سکتا کیونکہ یہ مادی چیز نہیں ہے ہمارے موجودہ دور میں سائکلوجی کے علم نے بہت ترقی کی اس موضوع پر بھی بہت کام ہوا ایک تو یہ دقت ہے کہ سائیکالوجی کے ماہرین کسی ایک معاملہ میں بھی متفق نہیں ہیں ان میں ہر معاملہ میں اختلاف ہی اختلاف ہے اس معاملہ میں بھی وہ مختلف الخیال ہیں اور جو ماہرین نفس انسانی کے قائل ہیں وہ بھی اس کو Define نہیں کر سکے نفس کا مظاہرہ اس کے اختیار و ارادہ سے ہوتا ہے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ایسی غیر مادی چیز ہے جو اختیار و ارادہ کی استعداد کی حامل ہے اختیار و ارادہ صرف خدا کو حاصل ہے یا اس کا عطا کردہ انسان کو حاصل ہے اس کے علاوہ کائنات میں کسی کو اختیار و ارادہ حاصل نہیں ہے اگر کوئی شخص مستقل اقدار کا اتباع کرتا ہے تو اس کی نفس میں صفات خداوندی منعکس ہو جاتی ہیں اس کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے انسان کی خوابیدہ صلاحیتوں میں اضافہ کرنا ان کو نشوونما دینا ہی تزکیہ نفس ہوتا ہے نفس کا موضوع بہت طویل ہے۔ قرآن نے اس کو جگہ جگہ موقع بہ موقع تقریباً سب سورتوں میں Discuss کیا ہے جو لوگ سائیکالوجی کے ماہر ہیں اور قرآن کا مطالعہ بھی کرتے ہیں ان کا قول ہے کہ جب ہم قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کوئی سائیکالوجی کی کتاب پڑھ رہے ہیں نیز اس کتاب کو کسی خاتون نے تحریر کیا ہے کہ اس میں عورتوں کے حقوق ضرورت سے زیادہ رکھے گئے ہیں۔

(8) ایک اور بہت معنی خیز آیت پیش خدمت عالی کی جاتی ہے انسانی زندگی کے ارتقائی مراحل میں کہ جس میں بڑا

حصہ حیوانی زندگی کا ہے جبکہ تھوڑا حصہ اس میں وہ ہے کہ جس کی وجہ سے انسان مکمل ہوا ہے قرآن کریم کی رو سے زندگی تو کائنات کے وجود میں آنے سے پیشتر بھی موجود تھی لیکن قرآن کریم اس کو زندگی نہیں کہتا جب زندگی نے Life Cell کا پیکر پہن لیا تو قرآن نے اس کو نفس واحدۃ کے نام سے پکارا خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (4:1) یہاں سے زندگی کا سفر شروع ہوتا ہے ہزاروں لاکھوں سال میں زندگی طرح طرح کے پیکر میں بدلنے کے بعد انسان کے پیکر میں آئی اس سے پہلی اسٹیج ہے ارتقاء Evolution میں یہ ہوتا ہے کہ جب زندگی پچھلی زندگی سے ترقی کر کے اگلی منزل میں آتی ہے مستقر و مستورع (6:98) تو زندگی کی پہلی منزل جو ہوتی ہے وہ اسکی بہت سی خصوصیات ساتھ لے کر آتی ہے البتہ اس میں ایک بلندی کی خصوصیت شامل ہوجاتی ہے جو سابقہ منزل میں نہیں ہوتی تھی انسانوں کی زندگی کے اندر 1 / 2 حصہ حیوانیت کی سطح کا ہے کیونکہ اس اس کی سابقہ منزل حیوانیت کی ہی تھی کھانا، پینا، سونا، جاگنا، بیمار یا صحت مند ہونا، قوت محسوس ہونا، خوف محسوس ہونا، گرمی سردی محسوس ہونا افزائش نسل کرنا یہ سب کچھ اسی طرح ہوتا ہے جیسا کہ حیوانی زندگی کے اندر ہوتا ہے زندگی کا یہ حصہ پورا کا پورا حیوانی ہے اور یہ زندگی صرف حیوانیت کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے اس کا باقی 1/2 حصہ جب ساتھ ملتا ہے تو پھر یہ انسان بنتا ہے اور اس کے تقاضے مختلف ہوجاتے ہیں انسانیت کی سطح پر پہنچ جانے کے بعد اور اس کے انسانی تقاضوں کو پیش نظر رکھنے کے بعد ارشاد عالی ہوتا ہے:

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ؕ (13:17) ترجمہ: اس نے آسمان سے پانی برسایا تو وادیاں اپنے اپنے طرف کے مطابق بہہ نکلیں پھر سیلاب نے ابھرتے ہوئے جھاگ کو اٹھالیا اور اس ہی طرح کا جھاگ ان چیزوں کے اندر سے بھی ابھرتا ہے جن کو یہ زیور یا اسی قسم کی اور کوئی چیز بنانے کے لیے آگ میں تپاتے ہیں اس ہی طرح اللہ حق و باطل کو ٹکراتا ہے تو جھاگ تو بے مصرف ہو کر اڑ جاتا ہے لیکن جو چیز لوگوں کو نفع دینے والی ہوتی ہے وہ زمین پر باقی رہ جاتی ہے۔ اس آیۃ کریمہ میں قرآن کریم نے کائنات کی فطرت کو یوں واضح کیا ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ آسمان سے بارش ہوتی ہے تو وادیاں اور نالے بھر کے بہہ نکلتے ہیں پھر سیلاب جھاگ کو ابھار کر اوپر لے جاتا ہے پھر جھاگ تو ہوا میں اڑ جاتا ہے لیکن پانی جو ساری انسانیت کے لیے نافع ہوتا ہے وہ زمین پر ٹھہر جاتا ہے قرآن نے پھر دوسری مثال بیان کی کہ چاندی کو کوئی زیور بنانے کے لیے کٹھالی میں پگھلاتے ہیں تو اس کا میل کچیل تو اوپر اڑ جاتا ہے اور چاندی باقی رہ جاتی ہے ان دونوں مثالوں میں سے اس کائنات کا مزاج واضح کیا گیا ہے کہ یہ کائنات نافع کو باقی رکھنا چاہتی ہے اور غیر نافع کو برابر چھانٹتی رہتی ہے۔ پھر کائنات کے اس اصول پر اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کو مبنی قرار دیا کہ سنت الٰہی بھی یہی ہے کہ وہ حق و باطل کو آپس

میں ٹکراتا ہے اور اس ٹکراؤ سے حق و باطل کے اوپر باطل کا جھاگ جو ابھر آتا ہے وہ یوں ہی خس و خاشاک کی طرح اڑ جاتا ہے البتہ حق جو لوگوں کو نفع دیتا ہے وہ باقی رہ جاتا ہے۔

ان دونوں مثالوں سے قرآن نے یہ نتیجہ نکالا کہ قرآن کی صورت میں جو بارش زمین پر ہوئی ہے اس نے بھی جھاگ ابھار کر اوپر کر دیے ہیں لیکن یہ سارے جھاگ ختم ہو جائیں گے اور قرآن، اس کی تعلیم، اس کے نظریات اور اسکے حاملین دنیا میں رہ جائیں گے۔

ہم یہاں اپنے قارئین کرام سے درخواست کرتے ہیں کہ یہاں بہت غور و فکر سے یہ مقام ملاحظہ فرمائیں: فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ (13:17) وہ جو کھوٹ ہوتا ہے وہ بیکار چلا جاتا ہے قیمتی سونا کندن بن کے الگ ہو جاتا ہے یہاں سے قرآن کریم ایک اصول دیتا ہے اور وہ اصول یہ ہے کہ جب تم قرآن کریم کے قوانین کو اپنی معاشرتی زندگی میں رائج کر دو گے تو وہاں کیا ضائع ہوتا ہے اور کیا باقی رہ جاتا ہے وہ اصول یہ ہے وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ (13:17) جو کچھ تم اپنی ذات کے فائدے کے لیے کرتے ہو وہ تمہاری ذات کے لیے ختم ہو جاتا ہے جو کچھ تم پوری نوع انسانی کے فائدہ کے لیے کرتے ہو وہ باقی رہ جاتا ہے خیر و شر کا مسئلہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے فکر انسانی اس کو آج تک حل نہیں کر سکا ہے قرآن کریم نے چند لفظوں میں اس کو حل کر کے رکھ دیا ہے Good اور Evil کسے کہتے ہیں خیر و شر کیا ہوتا ہے کیسا قرآن نے حل کیا اضافی خیر اور اضافی شر تو ہر فلسفی بتاتا چلا آ رہا ہے خیر مطلق اور شر مطلق کیا ہوتا ہے یہ عقل انسانی نہیں بتا سکتی اور قرآن نے نہایت بلند آواز سے تحدی دی ہے کہ یہ آئندہ بھی نہیں بتا سکتی خواہ انسانی علوم کسی درجہ بھی ترقی کر لیں قرآن نے چیلنج دے دیا ہے کہ عقل انسانی خیر و شر کا تعین نہیں کر سکتی انسانی جذبات ہر شخص کے انفرادی اور مختلف ہوتے ہیں اس لیے عقل انسانی کے لیے خیر و شر کا پیمانہ بھی انفرادی ہے ہر حیوان اپنی بھوک کا سامان کرتا ہے اپنے فائدہ کے لیے ہر کوئی سوچتا ہے یہ حیوانی زندگی کا تقاضہ ہے ایک بیل گھاس کھا رہا ہے دوسرا بیل بندھا ہوا ہے اور بھوک سے بے قرار ہے دوسرے بیل کو اس کی پروا نہیں کہ گھاس ملے یا نہیں ملے یہ حیوانی زندگی ہے یہ بھی ضروری ہے۔ اس کو بھی پورا کرنا ہے لیکن یہ خیر نہیں عمل صالح نہیں وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ (13:17) جو کچھ تم پوری نوع انسانی کے لیے کرتے ہو وہ باقی رہنے والا ہے یہ جو یورپ کے مفکرین ہیں انہوں نے Servival of the fittest کا قانون بنایا وہ کائناتی قانون ہے۔ ٹھیک ہے اس کی دو مثالیں قرآن نے بیان بھی کر دیں۔ ان مفکرین کی یہی غلطی ہے کہ انہوں نے یہی کائناتی قانون انسانی دنیا میں بھی رائج کر دیا جو قوم اپنے کو فٹ رکھتی ہے وہ باقی رہتی ہے انہیں دوسری قوموں کی فکر نہیں ہوتی کی دوسری قوموں پر کیا گزر رہی ہے۔ اقبال کے الفاظ میں ان کی عقل عقل خود بین ہے عقل جہاں بین نہیں ہے آج ساری دنیا جو جہنم بن رہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حیوانی زندگی کا قانون انسانی زندگی پر Apply کیا جا رہا ہے قرآن کہتا ہے اپنی قوم، اپنا خاندان، اپنا قبیلہ، اپنا وطن، اپنا مذہبی فرقہ، کوئی اہمیت نہیں رکھتا قرآن اس سے اوپر چلا گیا ما ینفع الناس، الناس، خاندان، وطن، برادری، فرقہ،

سب سے آگے نکل گیا خیر وشر کی کسوٹی ہاتھ آ گئی بدی ونیکی کی کسوٹی ہاتھ آ گئی معترض کی Disappoinment دور کرنے کی بات ہاتھ آ گئی تکریم انسانیت کی بات ہاتھ آ گئی (11:86)۔

ایک اور بات عرض خدمت عالی ہے پھر اس مضمون کو ختم کیا جاتا ہے اور قارئین سے اس مضمون کی طوالت کے لئے معذرت خواہ ہیں۔ دنیا میں ہر قوم میں جتنے بڑے بڑے لیڈر اور ہیروز پیدا ہوئے ہیں یہ سب وہ ہیں جنہوں نے انسانیت کو تباہ کرنے کی Cost پر اپنی قوم کو آگے بڑھایا ہے۔ لندن میں پارلیمنٹ کے بالکل سامنے چرچل کا اسٹیچو ہے اس سے تھوڑی دور ایک سموسہ نما پارک میں چار اور اسٹیچو ہیں جن میں سے ایک Lord Camming کا ہے جو ہندوستان میں غدر کے وقت گورنر جنرل تھا کیونکہ اس وقت تک وائسرائے کا عہدہ شروع نہیں ہوا تھا یہ سب انگریزوں کے ہیروز ہیں اور انسانیت کے دشمن ہیں۔ چرچل کے لیے مشہور ہے کہ وہ ایک انگریز کو بچانے کی خاطر دوسری قوم کے سو آدمیوں کو قتل کروا دیتا تھا مگر اپنا ایک ہم قوم انگریز بچا لیتا تھا قوم اور وطن کا تصور ہی انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے یہ قرآن کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن انسانیت کے ٹکڑے کرنے کو سخت منع کرتا ہے۔ آپ غور فرمائیں کہ انگریزوں نے انسانیت کو دو صدیوں تک تگنی کا ناچ نچایا ہے اگر ان کے سامنے یہ آیت ہوتی اور ساری انسانیت کا مفاد پیش نظر ہوتا تو دنیا کا نقشہ اور ہوتا۔ اپنی پرسنل لائف، ذاتی تعلقات میں، انگریزوں سے بہتر کوئی قوم نہیں ہے بہترین اخلاق، جھوٹ سے نفرت، اب موجودہ دور میں جبکہ ان کی بھی معاشرتی حالت گر چکی ہے اس تنزل کے باوجود بہترین معاشرہ ایک دوسرے کی خدمت، ایثار تواضع، ان کا شعار۔ یہی برتاؤ اگر وہ ساری دنیا کے ساتھ رکھتے اور اپنی نگاہ کشادہ کر کے ساری انسانیت کی خدمت کرتے تو انسانیت ان کی مملکتی غلط Policies سے محفوظ رہتے جو ظلم پر مبنی ہوتی تھیں۔ نیو یارک امریکہ سے جو کتاب Leaving Islam طبع ہوئی ہے اس کا نہایت مختصر تعارف ہم نے شروع مضمون میں کرا دیا تھا۔ اس کتاب میں ان حضرات کے مضامین ہیں جو مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے لیکن انہوں نے اسلام ترک کر دیا انہوں نے اپنے مضامین میں اسلام ترک کرنے کی وجوہات بھی تحریر کی ہیں۔ ان حضرات میں ایک مضمون حسین احمد صاحب کا بھی ہے ہم ان کے مضمون میں طبع شدہ اعتراضات کا جواب دے رہے ہیں جس کی دوسری یہ قسط ہے مضمون چونکہ طویل ہو گیا ہے ہم اس کے لئے معذرت خواہ ہیں اب اگلا مضمون اس سلسلہ مضامین کی تیسری قسط انشا اللہ اگلے ماہ طبع ہوگی۔

یہ بات البتہ غور کرنے کی ہے کہ ہم جو نادر، آیات پیش کر رہے ہیں کیا اس دور میں ایک ناخواندہ شخص اس قسم کی آیات تحریر کر سکتا تھا۔ اس سلسلہ مضامین کا نقطۂ ماسکہ صرف یہی نقطہ ہے ہم ان حضرات کو اسی نقطہ کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں اور یہی مشورہ عرض کریں گے کہ آپ بلا تعصب ان مضامین کو مطالعہ کریں اور اپنے نظریات پر نظر ثانی فرمائیں۔

شعورِ آدمیت ناز کر اس ذاتِ اقدس پر
تری عظمت کا باعث ہے، محمدؐ کا بشر ہونا

بچوں کا صفحہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

نجمہ بہت ذہین بچی تھی۔ جو بات ایک بار سن لیتی وہ جیسے ہمیشہ کے لیے اسے یاد ہوجاتی۔ جس سے ایک بار مل لیتی، اس کا چہرہ اور نام کبھی نہ بھولتی۔ پڑھنے میں بھی وہ بہت تیز تھی۔ اپنی کلاس میں ہمیشہ اوّل آتی۔ اسے اپنی کتابوں کے اکثر سبق اور نظمیں زبانی یاد ہوگئی تھیں۔ نجمہ کو اپنے حافظہ پر بڑا غرور ہوگیا۔ اس نے محنت سے اپنی کتابیں پڑھنی چھوڑ دیں۔ ہر وقت قصہ کہانی کی کتابیں اور رسالے پڑھتی رہتی۔

آخر امتحان سر پر آ گیا۔ اب نجمہ تھی اور کورس کی ڈھیر ساری کتابیں۔ تاریخ، جغرافیہ، انگریزی، اردو، حساب، جنرل سائنس وغیرہ۔ نجمہ نے سب کتابیں یاد کرنے کی کوشش کی مگر آٹھویں جماعت کا کورس اتنا آسان تو ہوتا نہیں کہ دس بارہ دن میں پڑھ کر کوئی پاس ہوجائے۔

امتحان ہوا۔ نجمہ کے پرچے اچھے نہ ہوئے۔ چند دن کے بعد نتیجہ نکل آیا اور ہمیشہ اوّل آنے والی نجمہ فیل ہوگئی۔ تمام خاندان کو بہت حیرانی ہوئی کہ آخر یہ کیسے ہوگیا؟ مگر ہونے والی بات تو ہوچکی تھی۔

نجمہ بہت اداس اداس رہنے لگی۔ وہ اپنے کمرے سے بھی باہر نہ نکلتی۔ آخر اس کی امی اور ابّو نے اسے بہت سمجھایا:

''غم نہ کرو۔ صبر کرو۔ انشاء اللہ اگلے سال پاس ہوجاؤ گی۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

نجمہ کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ آخر صبر کرنے سے کوئی پاس کیسے ہوسکتا ہے؟ صبر کرنے سے دوسرے کام کیسے ہوسکتے ہیں؟ نجمہ کے ذہن میں بہت پریشانی پیدا ہوگئی۔ ایسی پریشانی جو ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔

ایک دن نجمہ کے ماموں کراچی سے لاہور آئے۔ نجمہ کو اپنے ماموں سے بہت پیار تھا۔ وہ بہت خوش ہوئی اور اس خوشی میں اپنے فیل ہونے کا غم بھول گئی۔ ماموں نے نجمہ کو لاہور کی خوب سیر کروائی۔ جہانگیر کا مقبرہ، بادشاہی مسجد، شالامار باغ، باغ جناح، چڑیا گھر، مینارِ پاکستان، جلو پارک، ریس کورس پارک، گلشنِ اقبال پارک، قائداعظم لائبریری اور بھی کئی جگہوں پر خوب گھومے پھرے۔ جب اتوار آیا تو انہوں نے صبح ہی صبح نجمہ سے کہا:

''بیٹی آٹھ بجے تک تیار ہوجانا۔ آج ہم درسِ قرآن سننے چلیں گے۔ قرآن مجید، اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ اس کتاب کی اچھی اچھی اور پیاری پیاری باتیں سمجھ کر اور ان پر عمل کر کے ہم بڑی ترقی کر سکتے ہیں۔ یہی ہماری بڑائی کا واحد راستہ ہے۔ آج مسلمان دنیا کی دوسری قوموں سے کتنا پیچھے رہ گئے ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ اب وہ قرآن مجید سے اپنی

زندگی کے لئے روشنی حاصل نہیں کرتے۔''

نجمہ اندر جا کر عورتوں اور اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ بیٹھ گئی۔ وہاں اسے معلوم ہوا کہ جو صاحبِ درس قرآن دیتے ہیں۔ اُنہیں یہ سب لوگ ''باباجی'' کہتے ہیں۔ دس بجے درس قرآن شروع ہوا۔ باباجی نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر اپنی تقریر شروع کی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی نجمہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ باباجی تو ''صبر'' کے بارے ہی میں تقریر کر رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ قرآن مجید کی روشنی میں صبر کسے کہتے ہیں۔

باباجی نے بتایا:

''عربی زبان میں صبر کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص اپنا کام مکمل کرنے کے لئے بھرپور محنت کرتا رہے۔ لگاتار کوشش اور اپنے مقصد پر مضبوطی سے ڈٹ جانے کو صبر کہتے ہیں۔ اسی لیے پہاڑ کو ''الصبیر'' کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنی جگہ پر مضبوطی سے جما کھڑا رہتا ہے۔''

نجمہ بہت پڑھی لکھی تو نہ تھی کہ باباجی کی تمام باتیں اس کی سمجھ میں آجاتیں مگر اس نے بڑے غور سے تقریر سنی۔ صبر کے سچے اور اصلی معنی اس کی سمجھ میں آ گئے۔

باباجی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی مثال دے کر بتایا کہ وہ تھے سچے صبر والے جو اللہ کے راستے پر ڈٹ کر آگے بڑھتے رہے۔ مشکلیں آئیں، مخالفین نے جنگیں کیں مگر نہ تو ان لوگوں میں کمزوری آئی اور نہ ان کے قدم سست پڑے۔

جب تقریر ختم ہوئی تو جیسے نجمہ کے ذہن کی الجھن دور ہوگئی اور یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ ''اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

گھر واپس جاتے ہوئے نجمہ نے اپنے ماموں سے کہا:

''ماموں جی! اب میں بہت محنت سے پڑھوں گی۔ یہی تو صبر ہے مگر زیادہ تر لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ جب کسی آدمی کے غلط کاموں کا بُرا نتیجہ اس کے سامنے آتا ہے تو اس سے کہتے ہیں صبر کرو۔ آخر ایسے صبر سے کیا ہو سکتا ہے۔ توبہ توبہ''۔

ماموں کہنے لگے:

''بیٹی! مسلمان کی تباہی کی وجہ یہی تو ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ تو باقی رہ گئے ہیں مگر ان کے معنی بدل گئے ہیں۔ میری بیٹی! تم محنت سے پڑھو اور قرآن مجید کو اپنا ساتھی بنا لو۔ یوں تمہاری زندگی بھی سنور جائے گی اور تمہارے آس پاس والوں کی بھی۔''

قارئین طلوعِ اسلام توجہ فرمائیں

ماہنامہ طلوعِ اسلام کی درجِ ذیل سالانہ خوبصورت جلدیں 800 روپے فی جلد کے حساب سے دستیاب ہیں۔ اپنے کتب خانوں میں ''طلوعِ اسلام'' کے فائلز مکمل کرنے کے لئے آرڈر فرمائیے۔ شکریہ

1972، 1975، 1976، 1977، 1983، 1984، 1985، 1986، 1987، 1988، 1991، 1999، 2000، 2001، 2002، 2003، 2004، 2005، 2006، 2011، 2015، 2016، 2017، 2018۔

اَلْحَمْد سے وَالنَّاس تک

مسلسل قرآنِ کریم کے سمجھنے اور سمجھانے کا بالکل نیا انداز

مفہوم القرآن

(پرویز)

یہ نہ قرآنِ کریم کا ترجمہ ہے، نہ تفسیر بلکہ اِس کا مفہوم ایسے واضح، مسلسل، مربوط اور دِلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے جس سے قرآنی مطالب تابندہ ستاروں کی طرح نگہِ بصیرت کے سامنے اُبھر کر آجاتے ہیں۔

نیا اور کمپیوٹر کمپوز ڈ ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔

کمپیوٹر کمپوزنگ اور کتابت کا حسین اِمتزاج

طباعت کا اعلیٰ ترین معیار

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) 25 بی، گلبرگ 2، لاہور

tolueislam@gmail.com ; www.islamicdawn.com

www.facebook.com/tolueislam.trust

Phone: +92 42 35753666

Surah *Muhammad* (محمّد) – Durus-al-Qur'an: Chapter 2

By G. A. Parwez (Episode No.3)

(Translated by: Mansoor Alam)

Our fictional stories

My dear friends, what an irony that our interpreters of Quran, instead of describing the reality, have presented fictional stories about the Prophet (PBUH). They have interpreted the above verse that when the situation became extremely intense and the Prophet (PBUH) saw that it would be difficult to gain victory over such a large and powerful army of Quraysh, then he grabbed some pebbles in his fist and threw at the Quraysh and, as a result, the entire army of Quraysh became blind and thus they lost the war!

Then they came up with even more fictional stories. Allah is saying that you were not slaying the enemy but Allah did; that you were not throwing the arrows but Allah did. But here are our interpreters saying that birds were carrying pebbles in their beaks and dropping them on elephants' heads that completely crushed their heads; and the pebbles came out through their stomachs. Can you imagine my friends how base the mentality is of these interpreters and their blind followers!?

These three hundred Mujahedeen came out to give their lives for Allah's cause and fought the mighty Quraysh with such fortitude that Western historians say that it changed the history of the world. This was the high position of these three hundred Mujahedeen. This was the place that Allah helped them – and whose swords and arrows He attributed to Himself. Allah is giving them credit for their valor and bravery in fighting and for not fearing the mighty Quraysh, so much so that He is attributing to Himself their swords and arrows. But here are our interpreters who are giving credit to pebbles that miraculously made Quraysh blind and this was the reason of Mujahedeen's victory! No wonder, the sermonizer becomes happy that he made the audience

rejoice with his fancy story. However, he completely tarnished the position of these Mujahedeen!

The Party of Allah and the party of Satan

Please note that Allah does His work through the hands of humans who stand for Him; who fight and give their life for His cause – which is actually the cause of universal humanity. What a great position he assigns to this party by calling it Allah's party! It is no secret that tyrants and oppressors who want to crush weak people, they even destroy their places of worship. Although there are new human charters that are supposed to protect these sacred places, but there are some who do not respect that even these days, e.g., Israel. We keep saying very proudly that for thousand years this nation is in under God's wrath. But at the hands of this tiny nation – which it got with help from others – multitude of Muslim nations with more than billion people are helpless. It is openly violating the sanctity of Masjid Aqsa but all these Muslim nations cannot do anything.

The Quran says: الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّـهُ ? وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّـهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّـهِ كَثِيرًا ? وَلَيَنصُرَنَّ اللَّـهُ مَن يَنصُرُهُ ? إِنَّ اللَّـهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ (22:40) – The only fault of the oppressed people who were unjustifiably driven from their homes was that they proclaimed Allah alone as their Sustainer. But evil rebellious forces never easily permit people to exercise the option of having their own Sustainer. Imagine, if Allah had not enabled people to defend themselves against others and let loose the rebellious forces to do whatever they liked, they would have not even spared places of worship like monasteries, churches, synagogues and mosques, where Allah's name is proclaimed profusely. These places would have been pulled down long ago. Allah will thus most certainly help any group which rises to defend the system based on justice and equity (wherein the freedom to worship is the basic right). Indeed Allah is most powerful and reigns supreme over everything.

From this verse it is clear that, although the Quran says that other religions are false, but it still respects their feelings – and even orders Momineen (مومنین) to protect their places of worship. Is there any truth then to the propaganda that Islam spread by sword? In fact, the Quran

provides protection of other's religious places through the hands of Momineen (مومنین) because Allah, the Almighty, says: His work in this world is accomplished through human hands – who come to the battlefield to protect all the places of worship. In another place the Quran says: وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰـهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ (2:251) – if Allah did not check oppressive forces through others, there would be chaos all over the Earth. To subdue the chaos Allah does not Himself come to the battlefield to fight. He gets this done through human group – the Mujahedeen. So, why is there so much chaos all around the globe? It is because there is no group working on behalf of Allah – there is no party of Allah. If there were such a group then it would stand up for the cause of Allah and then He would help this group to stop the chaos. Allah only helps those who help Him.

Allama Iqbal's explanation of Allah's Taqdir

Iqbal tells Muslims:

Why is there no storm in your river?
Why is your "self" not a Muslim?

And then he says:

It is futile to complain of Allah's Taqdir:
Why aren't you yourself Allah's Taqdir?

What a beautiful way Iqbal has explained this issue of Taqdir? Maybe, in future, people can understand the deep reality of what Iqbal has said. What is this Allah's Taqdir that Iqbal is talking about? Well, Iqbal beautifully captures the meaning of Allah's statement that "If you help me then We will help you." So, Iqbal is telling Muslims that instead of complaining about your pathetic condition, why don't you follow Allah's guidance first, i.e., do your part what Allah asks you to do, then Allah will definitely help you.

Disobeying Allah's law

We can see this statement "If you help Allah then Allah will help you" from another angle. This statement is conditional: The statement "If you help Allah" assigns "Responsibility" to humans. Everyday people demand "Rights" by taking out processions, by engaging in strikes and lockouts. No one talks about "Responsibilities." But every "Right"

comes with its "Responsibility": First fulfill your "Responsibility" then only you will earn the "Right." Allah says: وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيـــنَ (30:47) – it is incumbent on Us to help the مُؤْمِنِيـن (Momineen). This points to an important issue in the arena of human affairs and politics: if you want to have rights then fulfil your responsibility. If people fulfil their responsibility then it becomes incumbent on the head of state to give them their rights. If he does not do that then this will be against the Will of Allah. On the other hand, if people do not fulfil their responsibility then they do not have any right to demand rights.

Asking unconditional help from Allah is against His permanent principle

My dear friends, this is an important point to ponder about how to get "rights". The Quran provides unchangeable universal principle about it. And a regime that rules in the name of Allah must adhere to this principle. If people fulfil the divine responsibility then the regime has no choice but to give them their rights. But what do we do – what does the whole Muslim world do? – O Allah, give me this, or give me that! O Allah, get this or that work done! O Allah, help the needy, cure the sick. O Allah, help all the oppressed Muslims of the world! This is how we pray. As if, God forbid, Allah is our servant! As if Allah is someone that can be persuaded and be pursued by begging. This is the way we keep our relationship to Allah. We never think about what we are saying or what we doing in the name of Allah. *This way we continue and continue*, in spite of the fact that Allah has clearly spelled out how to get His help: First *do* what I ask you, then I will definitely help you; I will give what you want as of your earned right. Why are you begging me? Don't you feel even ashamed by begging? I want to raise your status and here you are making yourselves pathetic and degraded?

The essence of today's lecture

My dear friends, we can say that the essence of today's lecture has been to develop the true concept of Allah, and to highlight the true position of Adam. Allah says: Even if you ask Me as *baksheesh*, then you are degrading yourself. Why don't you ask Me as of right? He says: وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا (7:176) – We wanted to raise his status higher and higher though this Quran. [Please note the emphasis on the word "بِهَا"!] But he debases

himself: وَلَـٰكِنَّهُ أَخْلَدَ (7:176) – he sank to the lowest level and clung to it. How? وَاتَّبَعَ هَوَاهُ (7:176) – by following his base desires. He didn't listen to Me. Instead, he listened to his own emotions; he followed his own wishes.

My dear friends, instead of asking as of right, asking as baksheesh – even from Allah – demeans humanity. Allah says that ask Us as your right, i.e., fulfil your responsibility which We have mentioned in the Quran – then there is no question that We will not give you; then We become bound to help you. This is Our Law and this will never change: وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّـهِ تَبْدِيلًا (33:62) – And you will never find any change in this law. One does not ask *anything* from Islamic system as baksheesh. After fulfilling one's responsibility one asks as of right and the Islamic system is bound by divine law to deliver. My dear friends, *this* is the relationship between man and Allah according to the Quran.

Quranic teaching is unique in the entire world

My dear friends, as I had mentioned earlier, Allah's help makes humans steadfast; it makes them self-confident; it removes fears and uncertainty from their hearts; it makes them focused like a laser on the cause of Allah; it inculcates in them fortitude and courage during worst challenges they face against the powerful forces of evil.

Please note it down and internalize it. You will not find such uplifting and rejuvenating message anywhere outside the Quran. This is the uniqueness of the Quranic teaching; this is the beauty of its unparalleled guidance and unique message. The Quran establishes the correct position of man in this Universe; it provides the real concept of Allah. And it creates the true working relationship between humans and Allah through the Quran. If humans are able to achieve this then they do not need anything else.

My dear friends, we could only cover one verse (47:7) today. I hope I have been to do justice to this verse and explained it thoroughly and clearly. We will start our next lecture from verse (47:8) of Surah Muhammad (محمّد).

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں، انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور سُستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو، جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔



(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)



PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL. 72
ISSUE
8

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666 E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/
www.youtube.com/idaratolueislam/



اُمید، ہمت اور خود اعتمادی

میرے ہم وطنوں کے لیے یہی میرا پیغام ہے

(قائداعظمؒ کا قوم سے خطاب، 24 اکتوبر 1947ء)